اس شمارے میں

اس شمارے میں	شاہد رضا	۴
قرآنیات		
سورۃ یونس (۴)	جاوید احمد غامدی	۵
معارف نبوی		
کڑکا سننے پر کیا کہنا چاہیے	امین احسن اصلاحی	۱۱
مقالات		
اسلام میں اتحاد کا طریقہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک مسلمانوں کا طرز عمل	امین احسن اصلاحی	۱۵
سیر و سوانح		
حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ	محمد وسیم اختر مفتی	۳۱
نقد و نظر		
قوّامیت کے تقاضے	رضوان اللہ	۳۹
یسئلون		
انسان کی فطرت اور اس کا طرز عمل	امین احسن اصلاحی	۴۶

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شاہد رضا

”قرآنیات“ میں حسب سابق جناب جاوید احمد غامدی کا ترجمۂ قرآن ”البیان“ شائع کیا گیا ہے۔اس میں سورۂ یونس (۱۰) کی آیات ۲۸-۳۶ کا ترجمہ اور حواشی شامل ہیں۔گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ مشرکین کے مزعومہ شرکا اور شفعا ان کے کام نہیں آئیں گے،ان آیات میں تفصیلاً بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے صرف زعم کی وجہ سے ان کو ہدایت سے نہیں نوازے گا۔

”معارف نبوی“ میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ”کڑکا سننے پر کیا کہنا چاہیے“ اور ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ کے بارے میں“ شامل کیا گیا ہے۔یہ ”موطا امام مالک“ کی چند روایات پر مشتمل ہے۔

”مقالات“ میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ”اسلام میں اتحاد کا طریقہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک مسلمانوں کا طرز عمل“ شامل اشاعت ہے۔انھوں نے بیان کیا ہے کہ اہل اسلام کو اپنے دینی معاملات میں ترجیح قرآن مجید ہی کو دینی چاہیے، کیونکہ خلفاے راشدین کے زمانے تک آزادی رائے کے باوجود انتشار نہیں پایا جاتا تھا۔وہ انفرادی و اجتماعی معاملات میں کتاب اللہ سے رہنمائی لیتے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”سیر و سوانح“ میں جناب محمد وسیم اختر مفتی صاحب کا مضمون ”حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ“ شائع کیا گیا ہے۔اس میں انھوں نے ان کے متعدد فضائل کے علاوہ واقعۂ ہجرت مدینہ، سریۂ عبداللہ بن جحش، سریۂ عکاشہ، غزوۂ بدر و احد، غزوۂ خندق، غزوۂ ذی قرد، جنگ بزاخہ میں کردار اور ان کی روایت حدیث کو بیان کیا ہے۔

”نقد و نظر“ میں جناب رضوان اللہ صاحب کا مضمون ”قوّامیت کے تقاضے“ شامل اشاعت کیا گیا ہے۔اس میں انھوں نے آیت ’فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ‘ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آیت میں وہ دو تقاضے بیان ہوئے ہیں جو خاوند کی سربراہی کی وجہ سے بیویوں پر لازم آتے ہیں۔

”یسئلون“ میں سوال و جواب کی صورت میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ”انسان کی فطرت اور اس کا طرز عمل“ شائع کیا گیا ہے۔ان کا موقف ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ انسان کی فطرت کی نیکی پسندی کا لازمی تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ وہ برائی کی راہ نہ اختیار کرے یا نہ اختیار کر سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس

(۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ

(یہ) اُس دن کو یاد رکھیں، جب ہم اِن سب کو اکٹھا کریں گے[۴۴]، پھر جنھوں نے شرک کیا ہے، اُن سے کہیں گے کہ تم اپنی جگہ ٹھیرو[۴۵] اور تمھارے بنائے ہوئے شریک بھی، پھر اُن کے درمیان جدائی ڈال دیں گے[۴۶] اور اُن کے شریک کہیں گے: تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ اللہ ہمارے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہم تمھاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے[۴۷]۔ اُس وقت

۴۴؎ یعنی اِن کو بھی اور اِن کے معبودوں کو بھی۔ آیت میں 'جَمِيْعًا' کی تاکید اِسی مدعا کے لیے ہے۔

۴۵؎ اصل میں 'مَكَانَكُمْ' کا لفظ ہے۔ اِس سے پہلے 'امکثوا' یا 'قفوا' یا اِن کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ عربی زبان میں یہی اسلوب ہے۔ اِس طرح کے موقعوں پر ہماری زبان میں ظرف یا مفعول کو حذف کر دیتے ہیں۔

۴۶؎ مطلب یہ ہے کہ معبود اپنے عابدوں سے اظہار براءت کر دیں گے اور بالکل الگ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے۔ آگے اِس کی وضاحت کر دی ہے۔

اَسۡلَفَتۡ وَرُدُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ مَوۡلٰہُمُ الۡحَقِّ وَضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۳۰﴾

قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ یَّمۡلِکُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَمَنۡ
یُّخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَیُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ وَمَنۡ یُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ
اللّٰہُ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الۡحَقُّ فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ

ہر شخص اپنے اُس عمل سے دوچار ہوگا[۴۸] جو اُس نے کیا تھا اور لوگ اللہ، اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے اور (دوسروں کو معبود بنا کر) جو جھوٹ اُنھوں نے گھڑے تھے، سب اُن سے جاتے رہیں گے۔ ۲۸-۳۰

(اِن سے) پوچھو، زمین و آسمان سے کون تمھیں روزی دیتا ہے؟ یا سمع و بصر کس کے اختیار میں ہیں؟ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ کون اِس نظم عالم کی تدبیر کررہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ[۴۹]، تو کہو، پھر (اُس سے) ڈرتے نہیں ہو[۵۰]؟ سو یہی اللہ تمھارا پروردگار حقیقی ہے[۵۱]، تو حق

۴۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنۡ کُنَّا عَنۡ عِبَادَتِکُمۡ لَغٰفِلِیۡنَ'۔ اِن میں 'اِنۡ' درحقیقت 'اِنَّ' ہے جس پر 'لَغٰفِلِیۡنَ' کا لام دلالت کررہا ہے۔

۴۸؎ اصل میں 'تَبۡلُوۡا کُلُّ نَفۡسٍ' کے الفاظ ہیں۔ 'بلا یبلوا' کے معنی جانچنے اور تجربہ کرنے کے ہیں۔ یعنی اپنے عمل کا تجربہ کرے گا اور اُس کے نتائج بھگتے گا۔

۴۹؎ اِس سے واضح ہے کہ خدا کی جو صفات یہاں بیان ہوئی ہیں، اہل عرب اُن میں سے کسی کو بھی اپنے معبودوں سے متعلق نہیں سمجھتے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...وہ جن دیویوں دیوتاؤں کو پوجتے تھے، اُن کے متعلق اُن کا عقیدہ یہ نہیں تھا کہ یہ آسمان و زمین کے خالق ہیں یا ابر و ہوا اور سورج اور چاند کے موجد ہیں یا زندگی اور موت پر متصرف ہیں یا نظام کائنات کا سررشتہ اِن کے ہاتھ میں ہے، بلکہ صرف یہ مانتے تھے کہ یہ خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ خدا اِن کی سنتا ہے، جو کام خدا سے کرانا چاہیں، کرا سکتے ہیں، اِن کو اگر راضی رکھا جائے تو یہ خدا سے سفارش کر کے دنیا کی نعمتیں بھی دلواتے ہیں اور اگر بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی ہوا اور حساب کتاب کی نوبت آئی تو اُس وقت بھی یہ دست گیری کریں گے اور اپنی بندگی کرنے

فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ ﴿۳۲﴾ کَذٰلِکَ حَقَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡۤا اَنَّہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾

قُلۡ ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ؕ قُلِ اللّٰہُ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۳۴﴾ قُلۡ ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ

کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے؟[52] آخر تم کدھر پھرے جاتے ہو؟[53] اِسی طرح تیرے پروردگار کی بات اِن سرکشی کرنے والوں کے حق میں پوری ہو چکی ہے کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔[54] ۳۱-۳۳

(اِن سے) پوچھو، تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہو، پھر اُس کا اعادہ بھی کرے؟ کہہ دو، اللہ ہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اُس کا اعادہ کرے گا۔ سو کہاں

والوں کو نہ صرف بخشوالیں گے، بلکہ اونچے اونچے درجے دلوائیں گے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۴۷)

۵۰؎ یعنی جب یہ ساری باتیں مانتے ہو تو اُس خدا کے قہر و جلال سے ڈرتے نہیں کہ اُس پر افترا کر کے دوسروں کو اُس کی خدائی میں شریک بنا دیتے ہو؟

۵۱؎ مطلب یہ ہے کہ جس کو خدا مانتے ہو، تمھارا رب حقیقی بھی وہی ہے۔ اُس کے سوا جنھیں رب بنائے بیٹھے ہو، اُن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۵۲؎ یعنی خدا سے متعلق جن باتوں کو مانتے ہو، اُن کا منطقی نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ اپنا رب بھی تنہا اُسی کو تسلیم کرو۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ یہی حق ہے تو اِس حق کے خلاف جو کچھ بھی مانتے ہو، اُسے صریح ضلالت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

۵۳؎ اصل میں 'تُصۡرَفُوۡنَ' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی پھرائے جانے کے ہیں۔ اِس میں یہ اشارہ ہے کہ عقل و منطق تو کسی اور طرف لے جا رہی ہے، لیکن تم نے اپنی باگ کس کے ہاتھ میں دے دی ہے جو تمھیں اِس طرح ہرزہ گردی کرا رہا ہے۔

۵۴؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے آپ کی طرف التفات ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اِن کے تضادات فکر و عمل کو دیکھ کر آپ پریشان نہ ہوں۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ ایمان و ہدایت کی راہ اُنھی لوگوں پر کھلتی ہے جو اُس کے سچے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قُلِ اللّٰهُ يَهۡدِىۡ لِلۡحَقِّ اَفَمَنۡ يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ اَحَقُّ اَنۡ يُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا يَهِدِّىۡۤ اِلَّاۤ
اَنۡ يُّهۡدٰى‌ فَمَا لَـكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ اَكۡثَرُهُمۡ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ
لَا يُغۡنِىۡ مِنَ الۡحَـقِّ شَيۡـئًا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

بھٹکے جاتے ہو[۵۵]۔ پوچھو، تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ کہہ دو، اللہ ہی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر (بتاؤ)، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ اِس کا مستحق ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے یا وہ جو رہنمائی کے بغیر خود راہ نہیں پاتے؟ آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو[۵۶]؟ حقیقت یہ ہے کہ اِن میں سے اکثر محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان ذرا بھی حق کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں[۵۷]۔ ۳۴-۳۶

طالب ہوں اور اپنے اِس مطلوب تک پہنچنے کے لیے عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اِس کے برخلاف جو لوگ عقل و فطرت کو ٹھکرا کر اپنی باگ خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے لیے ہدایت کی راہ کبھی نہیں کھولتا، بلکہ اُن کی اختیار کردہ ضلالت ہی کو اُن پر مسلط کر دیتا ہے۔ آیت میں 'کَلِمَتُ رَبِّكَ' سے یہی سنت الٰہی مراد ہے اور 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ مشرکین کے اُس رویے کی طرف ہے جو پیچھے مذکور ہوا ہے۔

۵۵؎ یعنی جب یہ مانتے ہو کہ خلق کا ابدا اور اعادہ صرف خدا ہی کی شان ہے تو اُس کی جزا و سزا میں دوسروں کو کس طرح شریک ٹھیراتے ہو؟ یہ اِس لیے پوچھا ہے کہ مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اگر قیامت ہوئی بھی تو اُن کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، اُن کے شرکا و شفعا اُنھیں خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔

۵۶؎ مطلب یہ ہے کہ جو دنیا اور آخرت، دونوں کے لحاظ سے بے کار ہیں، اُنھیں کس طرح معبود بنا کر پوجنے کے لیے تیار ہو جاتے ہو؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...مخلوق کی ایک بہت بڑی ضرورت خالق سے یہ وابستہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں رہنمائی فرماتا ہے کہ کیا حق ہے اور کیا باطل، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمھارے اِن معبودوں سے تمھیں اِس طرح کی کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے؟ کیا عقل جو تمھارے اندر رہنمائی کا چراغ ہے، یہ اُن کی بخشی ہوئی تمھیں ملی ہے؟ کیا یہ تمھاری ہدایت کے لیے کوئی وحی بھیجتے ہیں؟ کیا اِنھوں نے تمھاری تربیت و تزکیہ کے لیے کوئی کتاب اتاری، کوئی رسول بھیجا، کوئی شریعت نازل کی، کوئی قانون اتارا؟ اگر اِن کاموں میں کوئی کام بھی اِنھوں نے نہیں کیا، نہ کرتے ہیں،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نہ کریں گے تو آخر کس غرض کے لیے اِن کے پیچھے لگے ہو؟ پیروی کا سزاوار وہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اُس کی توفیق بخشتا ہے یا وہ جو خود رہنمائی اور دست گیری کے محتاج ہیں؟ تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے الٹے فیصلے کرتے ہو؟''(تدبرقرآن ۴/۵۰)

۵۷؎ یہ مخاطبین کے لیے دھمکی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اللہ اِن کے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے، اِس لیے وہ وقت عنقریب آجائے گا جب وہ یہ سب کچھ اِن کے سامنے رکھ دے گا اور اِن میں سے کوئی اپنے جرائم کا انکار نہ کر سکے گا۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امین احسن اصلاحی
ترتیب وتدوین: خالد مسعود۔سعید احمد

کڑکا سننے پر کیا کہنا چاہیے

(اَلْقَوْلُ اِذَا سَمِعْتَ الرَّعْدَ)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَحَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ عَامِرِبْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَیْرِ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا سَمِعَ الرَّعْدَ تَرَكَ الْحَدِیْثَ وَقَالَ: سُبْحَانَ الَّذِیْ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ، ثُمَّ یَقُوْلُ: اِنَّ هٰذَا لَوَعِیْدٌ لِاَهْلِ الْاَرْضِ شَدِیْدٌ.

امام مالک عامر بن عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب وہ کڑکا سنتے تو بات کرنا چھوڑ دیتے اور یہ دعا پڑھتے: 'سُبْحَانَ الَّذِیْ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ' (پاک ہے وہ ذات کہ بجلی بھی اس کی تسبیح کرتی ہے اس کی حمد کے ساتھ اور ملائکہ بھی اس کی تسبیح کرتے ہیں اس کے ڈر کے ساتھ)، پھر کہا کرتے تھے کہ یہ اہل زمین کے لیے بڑی سخت وعید ہے۔

وضاحت

یہ دعا قرآن مجید کی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر ''تدبر قرآن'' میں سورۃ الرعد کی آیت ۱۳ کے ذیل میں کر دی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ کے بارے میں

(مَا جَاءَ فِيْ تِرْكَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنَّ أَزْوَاجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَدْنَ اَنْ يَّبْعَثْنَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اِلٰى اَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ فَيَسْأَلْنَهُ مِيْرَاثَهُنَّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ لَهُنَّ عَائِشَةُ: اَلَيْسَ قَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ازواج مطہرات نے یہ ارادہ کیا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجیں اور ان سے مطالبہ کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو جو میراث ملنی چاہیے، وہ دیں، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم انبیا کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو چھوڑتے ہیں، وہ صدقہ ہوتا ہے؟

وضاحت

اس حدیث کے سلسلۂ روایت میں ابن شہاب زہری موجود ہیں۔ یہ اہل سنت کے بہت بڑے امام ہیں۔ وہ تمام امور جن میں اہل سنت اور شیعہ کے درمیان اختلاف ہے کسی نہ کسی طور پر ابن شہاب سے مروی ہیں۔ مگر اس کے باوجود امام بخاری اور امام مالک نے ان کو سر پر اٹھایا ہے۔ یہ امت کے لیے بہت بڑا حادثہ ہے۔

'لَا نُوْرَثُ': ہمارے وارث نہیں بنتے، کوئی ہماری وراثت نہیں پاتا، جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت کی رو سے وراثت کی کوئی شکل نہیں رہتی، لیکن شیعہ اس کی قراءت میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ اس کو 'لا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ' پڑھتے ہیں اور اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ جو چیز ہم نے صدقے کے طور پر چھوڑی، اس کا کوئی وارث نہیں ہوتا، حالاں کہ یہ بالکل ہی بے تکی سی بات ہے۔ اگلی روایت میں حدیث کے مفہوم کی اور بھی وضاحت ہوگئی ہے۔ بہرحال یہ ہمارے اور شیعوں کے درمیان ایک بنیادی جھگڑا ہے۔ اس روایت کے حوالہ سے انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ انھوں نے اختراع کر کے گویا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر ازواج مطہرات کو وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہ بات صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خاص نہیں، بلکہ سب انبیا کے لیے ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی وراثت کا ذکر سورۂ مریم میں آیا ہے تو وہ دین، نیکی، تقویٰ اور نبوت کی وراثت کے متعلق ہے، اس لیے کہ ان کو اس بات سے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ خاندان کی روایت کو بگاڑ دیں گے تب انھوں نے بیٹے کے لیے دعا کی تھی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَقْسِمُ وَرَثَتِیْ دَنَانِيْرَ مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ نِسَائِیْ وَمَؤُنَةِ عَامِلِیْ فَهُوَ صَدَقَةٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے وارث درہم و دینار کی وراثت تقسیم نہیں کریں گے۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے، اس میں سے میری بیویوں کے خرچ اور گھر کے کارکن کے مصارف کے بعد جو بچے، وہ صدقہ ہے۔

وضاحت

'مؤنۃ' کے معنی کفالت ہے اور 'عامل' سے مراد گھر کے کارکن ہیں۔ غلام ہوں یا خادم یا نوکر۔ اس سے جن لوگوں نے اور لوگ مراد لیے ہیں، وہ غلط ہیں۔ فرمایا کہ ازواج مطہرات کے اخراجات اور گھر کے کارکنوں کے مصارف اٹھانے کے بعد جو مال بچے گا، وہ سب صدقہ ہے، یعنی وہ قوم کی ملکیت یا جدید لفظوں میں سٹیٹ کی ملکیت

ہوگا۔ اموال فے شروع ہی سے حقیقت میں سٹیٹ کی ملکیت تھے، اس لیے کہ وہ حکومت کے مجموعی دبدبے سے حاصل ہوئے تھے اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ضرورت کے مطابق بحیثیت صاحب امر اسی طرح لیتے تھے، جس طریقہ سے ہر حکومت کا خلیفہ یا صدر ہوتا ہے تو اس کے مصارف کی کفالت حکومت کرتی ہے۔ یہ بات بحیثیت صاحب امر، یعنی حکومت کے ذمہ دار کی حیثیت سے تھی نہ کہ نبی کی حیثیت سے تھی۔ اس لیے کہ جہاں تک نبوت کا معاملہ تھا، اس کے متعلق تو قرآن مجید میں آیا ہے کہ 'لَا اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا' (میں تم سے اجر کا طالب نہیں)۔ چونکہ نبوت کے علاوہ آپ پر حکومت کی ذمہ داری بھی تھی تو ضروری تھا کہ حکومت ان کے مصارف پورے کرتی۔ کسی شخص کے مصارف پورے کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اہل وعیال اور اس کے متعلقین کی ضروریات بھی پوری کی جائیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی ازواج نبی ہونے کے علاوہ کچھ خصوصیات اور بھی تھیں۔ وہ خصوصیات تقدس کی بنا پر نہیں تھیں، تقدس تو بے شک ان کو حاصل تھا، لیکن یہ خصوصیات اس بنیاد پر تھیں کہ ملت اور دین کی مصلحت کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حکم دیا تھا: 'مَا کَانَ لَکُمۡ اَنۡ تُؤۡذُوۡا رَسُوۡلَ اللّٰہِ وَلَاۤ اَنۡ تَنۡکِحُوۡۤا اَزۡوَاجَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖۤ اَبَدًا. اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَظِیۡمًا'، ''اور تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے کبھی اس کے بعد نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین باتیں ہیں'' (الاحزاب ۳۳: ۵۳)۔ قطع نظر اس سے کہ نکاح ثانی ان کے شرف کے منافی تھا، اس میں خطرے بھی بہت تھے۔ کوئی شخص ان میں سے کسی سے نکاح کر کے معلوم نہیں کیا کیا پراپیگنڈہ کر سکتا تھا۔ اس طرح کی تمام باتوں کے سدباب کے لیے دین کی مصلحت یہی تھی کہ ان کو آیندہ نکاح سے روک دیا جائے۔ لہٰذا ان کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر تھی جو خلفاے راشدین اور بعد والے خلفا نے بھی ادا کی۔

اس روایت میں 'ما ترکت بعد نفقۃ نسائی' میں 'نساء' کا لفظ جو آیا ہے، وہ بیویوں کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی ہاشم یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے کہ وہ 'نساء' میں شامل نہیں۔ البتہ ازواج مطہرات کا کوئی کارکن، غلام یا خادم ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو شامل ہونا چاہیے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

امین احسن اصلاحی

اسلام میں اتحاد کا طریقہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک مسلمانوں کا طرز عمل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسلام میں اتحاد کی تاکید اور اس کا طریقہ

یہ اختلافات اور تعصّبات جو آج کل مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گئے ہیں، یہ اسلام کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ یہ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ اسلام نے تو نہ صرف ان اختلافات سے بچتے رہنے کی سخت تاکید کی تھی، بلکہ نہایت واضح طور پر وہ طریقہ بھی بتا دیا تھا، جس طریقہ پر عمل کر کے ان اختلافات سے محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ اور ساتھ ہی اس طریقہ کی خلاف ورزی کے سبب سے پچھلی امتیں جن خرابیوں میں مبتلا ہو چکی تھیں، ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا تاکہ مسلمان ان کے انجام سے عبرت حاصل کر سکیں۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ

”اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد رکھو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کو جوڑا اور تم اس کی رحمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے کھڈ کے بالکل کنارے

تَهْتَدُوْنَ، وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ.

(آل عمران ۳: ۱۰۳-۱۰۵)

پر کھڑے تھے تو اللہ نے تم کو اس سے بچایا۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیتوں کو کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم راہ یاب ہو۔ اور تم میں سے ایک خاص گروہ ہونا چاہیے جس کا کام یہ ہو کہ وہ لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ بن جانا جو (اللہ کی رسی کو چھوڑ کر) پراگندہ ہو گئے اور خدا کی طرف سے کھلی کھلی آیتیں پانے کے بعد انھوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مذکورہ بالا آیات میں مسلمانوں کو متحد رہنے کی تاکید بھی فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات بھی دی گئی ہیں:

پہلی ہدایت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو متحد ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنا چاہیے اور پراگندہ نہ ہونا چاہیے۔

'اللہ کی رسی' سے مراد وہ عہد میثاق ہے جو ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان ہوا ہے، یعنی قرآن مجید ــــ 'قرآن مجید کو مضبوط پکڑنے' سے مراد یہ ہے کہ خدا نے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے جو ضابطہ اس کے ذریعہ سے ہم کو دیا ہے، ہم اسی ضابطہ پر چلیں۔ اس کے خلاف کوئی ضابطہ نہ خود اپنے جی سے بنائیں اور نہ کسی دوسرے کے بنائے ہوئے کسی 'ضابطہ' کو، جو اس کے خلاف ہو، اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے لیے پسند کریں۔ ہر سوال جو ہمارے سامنے آئے، ہم سب سے پہلے اس کے حل کے لیے اسی کی طرف رجوع ہوں۔ ہر فکری و نظری الجھن میں وہی ہمارے لیے مصدر الہام ہو۔ ہر مشکل میں وہی ہماری رہنمائی کرے، جس چیز کو وہ حق قرار دے ہم اس کو حق قرار دیں اور جس چیز کو وہ باطل قرار دے دے، ہم اس کو باطل قرار دے دیں۔ ہر حال میں وہی ہمارا ہادی اور امام ہو اور ہم اس کی ہدایت کے خلاف کسی حالت میں بھی کسی کی رہنمائی قبول نہ کریں۔

'پراگندہ نہ ہونے' سے مطلب یہ ہے کہ 'حبل اللہ' کو چھوڑ کر ہم الگ الگ اماموں اور لیڈروں کی عصبیت میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ حق و ہدایت قرآن کے بجائے اشخاص و افراد کے اندر محصور ہو کر رہ جائے، یہاں تک کہ جو کچھ ان کی طرف منسوب کر کے روایت کر دیا جائے نہ اس کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے ہی کی ضرورت محسوس کی جائے اور نہ

یہی تسلیم کیا جائے کہ حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

دوسری ہدایت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایک سیاسی ادارہ (خلافت) اس مقصد کے لیے قائم کیا جائے کہ وہ ایک طرف عام خلق الٰہی کو اس بھلائی اور خیر کی طرف بلاتا رہے جس کی طرف قرآن نے رہنمائی کی ہے تاکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اختلاف اور پراگندگی کی جہنم سے نکال کر اتفاق و محبت کی شاہراہ پر کھڑا کر دیا ہے، اسی طرح تمام دنیا اتفاق و محبت کی برکتوں سے مالا مال ہو جائے۔ دوسری طرف وہ ادارہ مسلمانوں کو معروف پر چلتے رہنے اور منکر سے بچتے رہنے کی ہدایت کرتا رہے تاکہ مسلمان پھر اسی گڑھے میں نہ جا گریں جس سے قرآن مجید نے ان کو ہاتھ پکڑ کے نکالا ہے۔ اور ان کے اندر اختلافات کی وہی آندھیاں پھر نہ چلنے لگیں جو عرب جاہلیت میں چلا کرتی تھیں۔

تیسری نصیحت یہ فرمائی ہے کہ اس واضح ہدایت کے بعد تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جانا جو خدا کی طرف سے نہایت واضح ہدایات پانے کے باوجود الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے اور ان کے اندر جھگڑے اور اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ اشارہ یہود اور نصاریٰ کی طرف ہے جو حبل اللہ کو ترک کر دینے اور الگ الگ اماموں اور مقتداؤں کی بے جا عصبیت میں گرفتار ہو جانے کی وجہ سے تفرق اور اختلاف کی ایسی آفت میں مبتلا ہو گئے کہ ہر گروہ نے اپنے اپنے علما اور پیروں ہی کو اپنا رب بنا لیا اور کتاب اللہ سے ان کا سرے سے کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہ گیا۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی حالت کا نقشہ یہ پیش کیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ. (التوبہ ۹: ۳۱)	”انھوں نے اپنے عالموں اور صوفیوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا۔“

اس حالت میں مبتلا ہونے کی جو سزا یہود کو ملی، اس کا ذکر بھی قرآن مجید نے ان الفاظ میں فرما دیا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً. (المائدہ ۵: ۱۳)	”پس اس سبب سے کہ انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا جو ان سے باندھا گیا تھا، ہم نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور ان کے دل سخت بنا دیے۔“

ٹھیک یہی حال نصاریٰ کا بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو روشنی عطا فرمائی تھی، انھوں نے اس کی حفاظت نہیں کی، بلکہ اس کو گل کر کے وہ سرے سے اس چیز ہی سے محروم ہو گئے جو جھگڑوں کو چکانے والی اور اختلافات کو مٹانے والی

بن سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر جو اختلاف بھی اٹھا، قیامت تک کے لیے اس کے مٹنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی باہمی جنگ و جدال کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. (المائدہ ۵:۱۴)

''اور ان لوگوں سے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے عہد لیا تو انھوں نے اس چیز کا ایک حصہ بھلا دیا جس کے ذریعہ سے ان کو یاددہانی کی گئی تھی تو ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔''

دین میں کتاب الٰہی کی اہمیت و مرکزیت

قرآن مجید کی ان واضح ہدایات کا اثر یہ ہوا کہ جب تک امت کے اندر اصلی دینی روح موجود رہی، اس وقت تک مسلمانوں کے اندر جو مرکزیت قرآن مجید کو حاصل رہی، وہ کسی دوسری چیز کو حاصل نہیں ہوئی۔ یہی کتاب ان کے تمام فکر و عمل کا مصدر تھی۔ ہر پیش آنے والے معاملہ میں وہ اسی کی طرف رہنمائی حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے تھے۔ اور سب سے پہلے وہ اسی کتاب کے علم و عمل میں ماہر ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال كان الرجل منّا إذا تعلّم عشر اٰيات ولم يجاوزهن حتّٰى يعرف معانيهن والعمل بهن.

''ہم میں سے جو شخص قرآن مجید کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو وہ اس وقت تک ان کے آگے نہ بڑھتا جب تک ان کے معانی سے اچھی طرح واقف نہ ہو جائے اور ان پر عمل کرنے نہ لگ جائے۔''

اس کتاب کے علم کی جو قدر و عزت مسلمانوں کی نگاہوں میں تھی، اس کا اندازہ انھی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک دوسرے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ولو أعلم احدًا أعلم بكتاب اللّٰه تناله المطايا لأتيته.

''اگر مجھے پتا چلتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اللہ کی کتاب کا جاننے والا ہے اور سواریوں کے ذریعہ سے اس کے پاس پہنچا جا سکتا ہے تو میں اس کے پاس ضرور پہنچتا۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اور یہی کتاب تمام قضا اور فتویٰ کی بنیادی کتاب تھی۔ چنانچہ جن لوگوں کو مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کی خدمت پر مامور کیا جاتا تھا، ان کو تمام پیش آنے والے معاملات میں سب سے پہلے اسی کتاب کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا جاتا۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن معاذ أنه قال: لما بعثني رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إلى اليمن قال: كيف تقضي إذا عرض لك قضاء؟ قال: أقضي بكتاب اللّٰه، قال: فإن لم يكن في كتاب اللّٰه؟ قال: فبسنة رسول اللّٰه، قال: فإن لم يكن في سنة رسول اللّٰه؟ قال أجتهد رأيي ولا آلو، قال: فضرب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم صدره وقال: ألحمد للّٰه الذي وفق رسولَ رسولِ اللّٰه لما يرضى به رسول اللّٰه.

''معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ جب مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو فرمایا کہ ''جب تمھارے سامنے کوئی معاملہ فیصلہ کے لیے آئے گا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟'' میں نے جواب دیا کہ ''میں اس کا فیصلہ اللہ کی کتاب کی روشنی میں کروں گا۔'' فرمایا: ''اگر اللہ کی کتاب میں اس کے متعلق کوئی واضح بات نہ ملے تو کیا کرو گے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''پھر رسول اللہ کی سنت کے مطابق کروں گا۔'' پھر فرمایا: ''اگر رسول اللہ کی سنت میں بھی اس کے متعلق کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں کیا کرو گے؟'' میں نے عرض کیا: ''تو پھر میں اجتہاد کروں گا، اور اس اجتہاد میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ بات سنی تو میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ ''اس اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔''''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعینہٖ اسی بات کی ہدایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو فرمائی۔ انھوں نے ان کو لکھا:

إذا وجدت شيئًا في كتاب اللّٰه فاقض به ولا تلتفت إلى غيره وإذا أتى شيءٌ ليس في كتاب اللّٰه وليس في سنة رسول اللّٰه ولم يقل فيه أحدًا قبلك فإن شئت

''جب تمھیں اللہ کی کتاب میں کوئی بات مل جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کر دو اور اس کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ مت کرو اور جب کوئی ایسا معاملہ پیش آ جائے جس کے متعلق، نہ اللہ کی کتاب میں کچھ ہو نہ

أن تجتهد رأيك فتقدم وإن شئت أن تتأخر فتأخر وما أرى التأخر إلا خيرًا لك.

رسول اللہ کی سنت میں کچھ ہو اور نہ تم سے پہلے کسی اور ہی نے اس بارہ میں کوئی فیصلہ کیا ہو، تو تم اگر اس کے بارہ میں اجتہاد کرنا چاہو، تو اجتہاد کرو اور اگر توقف کرنا چاہو تو توقف کرو اور میں توقف کو تمھارے لیے بہتر خیال کرتا ہوں۔''

اسی مضمون کی روایات تھوڑے بہت تغیر اور بعض باتوں کی تشریح کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔ ان تمام روایات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خیر القرون میں، ہر معاملہ میں، پہلی سند اور پہلا مرجع اللہ کی کتاب تھی۔ کسی مفتی اور قاضی کے سامنے جب کوئی معاملہ لایا جاتا تو وہ اس کا جواب دینے یا اس کا فیصلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے کتاب اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا، جب اس میں اس کو کوئی واضح بات نہ ملتی تو پھر رسول کی سنت میں دیکھتا اور اگر اس میں بھی اس کو کوئی چیز نہ ملتی تو بدرجۂ آخر اجتہاد سے کام لیتا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سنت رسول اللہ

اور یہ سنت رسول اللہ، کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کتاب اللہ سے بالکل الگ ہو یا اس کے خلاف ہو یا کتاب اللہ کی مرکزیت کو نقصان پہنچانے والی ہو یا امت کی وحدت کو، جو 'حبل اللہ' کے ذریعہ سے قائم کی گئی ہے، کسی پہلو سے تقسیم کرنے والی ہو۔

سنت رسول اللہ درحقیقت کتاب الٰہی کی تشریح و تفسیر ہے۔ جو باتیں قرآن مجید کے اجمالات و اشارات کے اندر چھپی ہوئی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی باتوں کو واضح فرما دیا ہے۔ اس وجہ سے کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنے کی جو ہدایت کی گئی ہے، تو یہ کتاب اللہ سے الگ کسی چیز کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت نہیں کی گئی ہے، بلکہ کتاب اللہ ہی کی اس توضیح و تشریح کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو صحیح طریقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور و منقول ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی توضیح و تشریح کرنے کا حق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ کسی کو ہو سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی توضیح و تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توضیح و تشریح کے مقابل میں لائق قبول ہو سکتی ہے۔ البتہ اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف

صحیح ہو۔

ہمارے محقق علمانے سنت کی حقیقت یہی سمجھی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اپنے زمانہ کے منکرین حدیث وسنت کو جو جوابات دیے ہیں، اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

عن عمران بن حصين أنه قال لرجل إنك إمرء أحمق أتجد فی كتاب اللّٰه الظهر أربعا لا تجهر فيها بالقراء ة؟ ثم عدد عليه الصلٰوة و الزكٰوة ونحو هذا ثم قال أتجد فيه الصلٰوة والزكٰوة؟ ونحو هذا ثم قال أتجد فی كتاب اللّٰه مفسرًا؟ إن كتاب اللّٰه أبهم هذا وإن السنة تفسر ذلك.

''عمران بن حصین سے مروی ہے کہ انھوں نے کسی شخص (غالباً کسی منکر حدیث) سے کہا کہ تم ایک احمق آدمی معلوم ہوتے ہو۔ بھلا قرآن مجید میں کہیں واضح الفاظ میں یہ ہے کہ ظہر کی رکعتیں چار رکعتیں ہیں اور ان میں قراءت جہری نہیں ہونی چاہیے؟ پھر اسی طرح انھوں نے نماز، زکٰوۃ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کو گنا کر سوال کیا کہ کیا ان چیزوں کی تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں؟ قرآن نے تو ان چیزوں کو اجمالی طور پر بیان کیا ہے اور سنت نے ان کی تفصیل کر دی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایک اور محقق کا جواب ملاحظہ ہو:

عن أيوب أن رجلاً قال لمطرف بن عبد اللّٰه بن الشخير: لا تحدثونا إلا بالقران فقال له مطرف واللّٰه ما نريد بالقران بدلًا ولكن نريد من هو أعلم بالقران منا.

''ایوب سے مروی ہے کہ ایک شخص (غالباً کسی منکر حدیث وسنت) نے مطرف بن عبداللہ بن شخیر سے کہا کہ ہم سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ بیان کیا کرو۔ مطرف نے اس کو جواب دیا کہ خدا کی قسم، ہم قرآن کا بدل نہیں پیش کرتے، بلکہ اس شخص کی باتیں پیش کرتے ہیں جو ہم سے زیادہ قرآن کو جاننے والا تھا (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم)۔''

بعینہٖ یہی بات حدیث وسنت کے سب سے بڑے عالم، حضرت امام احمد بن حنبل سے بھی مروی ہے۔ وہ بھی سنت کو کتاب الٰہی کی تفسیر وتوضیح قرار دیتے ہیں اور نہایت واضح الفاظ میں اس امر کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ سنت کتاب اللہ کی کسی چیز کو رد نہیں کرسکتی۔ کتاب اللہ کو صرف کتاب اللہ ہی منسوخ کرسکتی ہے:

قال الفضل بن زياد: سمعت أبا عبد اللّٰه

''فضل بن زیاد نے کہا کہ ابوعبداللہ (یعنی احمد بن

يعني أحمد بن حنبل و سئل عن الحديث الذي روى أن السنة قاضية على الكتاب فقال ما أجسو على هذا أن أقوله أن السنة قاضية على الكتاب أن السنة تفسر الكتاب و تبينه قال الفضل: و سمعت أحمد بن حنبل يقول لا تنسخ السنة شيئًا من القراٰن قال لا ينسخ القراٰن إلا القراٰن.

حنبل) سے اس حدیث کی بابت سوال کیا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ 'سنت کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرسکتی ہے' انھوں نے جواب دیا کہ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ سنت کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرسکتی ہے۔ سنت تو کتاب اللہ کو واضح کرنے والی چیز ہے۔ فضل نے بیان کیا کہ میں نے احمد بن حنبل کو فرماتے سنا کہ سنت قرآن کی کسی بات کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ قرآن کو صرف قرآن ہی منسوخ کرسکتا ہے۔''

سنت کے معاملہ میں یہی مذہب حضرت امام شافعی اور جمہور اصحاب مالک کا بھی ہے۔

لیکن یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ چونکہ سنت قرآن کی ایسی تفسیر ہے جو ایک معصوم کی طرف سے کی گئی ہے، جس کا اجتہاد بے خطا اور جس کا استنباط بالکل قطعی اور بالکل غیر مشتبہ ہے، اس لیے قرآن کے بعد ہم نہ صرف اس کی پیروی کو ضروری قرار دیتے ہیں، بلکہ اس بات کو بھی صحیح قرار دیتے ہیں کہ اس کی جزئیات سے اصول وکلیات مستنبط کر کے بعینہٖ اسی طرح ان اصول وکلیات سے مسائل کی تخریج کی جائے، جس طرح قرآن سے مستنبط کلیات کی روشنی میں مسائل کی تخریج کی جاتی ہے۔ یہ درجہ کتاب اللہ کے بعد صرف سنت رسول اللہ کو حاصل ہے، سنت رسول کے سوا کسی امام و مجتہد کے اجتہادات واستنباطات کو یہ درجہ حاصل نہیں ہے کہ اس کے اجتہادات ہمارے لیے اصول اور سانچہ کا کام دے سکیں اور ہم ان کو کلیات کی حیثیت دے کر ان کو مسائل کی تخریج کے لیے بنیاد بنا سکیں۔

اجتہاد رائے

جس طرح سنت کتاب الٰہی سے کوئی الگ چیز نہیں ہے، اسی طرح اجتہاد رائے بھی کتاب الٰہی اور سنت سے کوئی علیحدہ شے نہیں ہے۔ اجتہاد رائے سے مراد یہ ہے کہ جن پیش آنے والے معاملات کے بارہ میں قرآن یا سنت رسول اللہ میں کوئی واضح بات موجود نہ ہو، ان پر قرآن وسنت کے اشارات کی رہنمائی میں غور کر کے یہ طے کرنا کہ ان میں کتاب اللہ اور سنت رسول سے لگتی ہوئی بات کیا ہوسکتی ہے۔ شریعت نے اس کے لیے جو شرطیں مقرر کی ہیں، ان کی رو سے صرف وہی لوگ اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں جو دین کی نہایت پختہ سمجھ رکھتے ہوں، جن کا مذاق کتاب وسنت کے مزاج سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہو، جو زندگی کے معاملات کے نشیب وفراز کے ساتھ ان مقاصد ومصالح کو

بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں جو شریعت کے احکام میں ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا عملی اور اخلاقی درجہ اتنا بلند ہو کہ ان کی نسبت یہ شبہ نہ کیا جا سکتا ہو کہ وہ اللہ کے دین کے معاملہ میں اپنی خواہشوں کو دراندازی کا موقع دیں گے یا کسی خوف اور طمع سے مغلوب ہو کر جھوٹے اجتہادات کریں گے اور جھوٹے فتوے دیں گے۔

فتویٰ اور اجتہاد میں سلف کی احتیاط

مسلمانوں کے اندر جب تک دینی روح باقی رہی، ہر کس و ناکس کی مجال نہیں تھی کہ وہ اجتہاد کرنے اور فتویٰ دینے کی جرأت کر سکے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارہ میں فرمایا تھا: 'اذا جرء کم علی الفتیا اجرء کم علی النار' (جو شخص تم میں سے فتویٰ دینے میں سب سے زیادہ دلیر ہے وہ جہنم میں چھلانگ لگانے کے لیے سب سے زیادہ دلیر ہے)۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تنبیہ کے سبب سے لوگ اجتہاد کرنے اور فتویٰ دینے کے معاملہ میں اس قدر احتیاط کرنے لگے تھے کہ اس سے زیادہ احتیاط کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت براء فرماتے ہیں کہ میں انصار میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سو بیس ایسے صحابیوں سے ملا ہوں جن کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی کہ کاش، اس کے بتانے کی ذمہ داری کوئی دوسرا اٹھا لے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ تھے اور ان کے منصب کی ذمہ داریوں میں یہ بات داخل تھی کہ وہ پیش آنے والے معاملات کے فیصلے بھی کریں گے، اور اگر ان کے قُضاۃ وعمّال کسی معاملہ میں ان سے رجوع کریں تو ان کی رہنمائی بھی کریں۔ لیکن ان کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ جب ان کے ایک عامل نے کسی معاملہ میں ان سے رجوع کیا تو انھوں نے اس کو جواب میں لکھا کہ 'واللّٰہ ما أنا بحریص علی الفتیا ما وجدت منہ بدًا' (خدا کی قسم، میں جب تک فتوے کی ذمہ داری سے بچ سکتا ہوں، اس وقت تک میں فتویٰ دینے کا خواہش مند نہیں ہوں، تمھارا علم اس ذمہ داری کے لیے کافی ہے)۔ انھی کا ارشاد ہے کہ 'أعلم الناس بالفتوی أسکتھم وأجھلھم بھا أنطقھم' (جو فتویٰ کی ذمہ داریوں سے جتنے ہی زیادہ واقف ہیں، وہ اتنے ہی زیادہ خاموش ہیں اور جو اس چیز سے جتنے ہی زیادہ بے خبر ہیں، وہ فتوے دینے میں اتنے ہی زیادہ بے باک ہیں)۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فقہا کا یہ حال تھا کہ وہ جب تک فتویٰ دینے کی ذمہ داریوں سے بچ سکتے تھے، اس وقت تک فتویٰ دینے سے گریز کرتے تھے، صرف اسی صورت میں اس بار گراں کو اٹھاتے جب اس کے لیے بالکل ہی مجبور ہو جاتے۔ حضرت امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے اپنے آپ کو فتوے کے لیے پیش کیا، اس نے اپنے سر بہت بڑی ذمہ داری

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لے لی۔ مفتی کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اللہ کے نام سے امر اور نہی کا اعلان کرتا ہے اور اس کے بارہ میں ایک دن اس سے پرسش ہونی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ ہم سے فتویٰ پوچھتے ہو اور ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش، ہم سے فتویٰ نہ پوچھا جاتا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منقول ہے کہ ان سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا تو وہ اس کا جواب اس طرح ڈرتے ہوئے دیتے گویا جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔

سلف سے اس قسم کے اقوال کا ایک دفتر منقول ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حضرات اجتہاد کرنے اور فتویٰ دینے میں اس قدر احتیاط اور اس قدر پرہیز گاری سے کیوں کام لیتے تھے؟ جس کام کو آج ہمارے دینی مدرسوں کے معمولی مدرسین اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے ہیں، آخر اس میں ایسا اشکال کیا چھپا ہوا تھا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جیسے لوگ اس سے تھرّاتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ جس معاملہ سے متعلق اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو، اس میں زبان سے کوئی بات نکالنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کتاب وسنت کے اشارات سے رہنمائی حاصل کر کے یہ متعین کرنا کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مزاج سے قریب تر بات فلاں ہے، کوئی آسان کام وہ نہیں خیال کرتے تھے۔ وہ اس راز سے بے خبر نہیں تھے کہ اس امت کی ہستی اللہ کی کتاب سے وابستگی ہی پر قائم ہے اور ایک مجتہد اور ایک مفتی اپنی غفلت یا اپنی کم علمی کے سبب سے اس وابستگی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جس کا وبال امت پر بھی آ سکتا ہے اور جس سے خود اس کی آخرت بھی برباد ہو سکتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے کہ ایک مجتہد اور مفتی خدا اور اس کے بندوں کے درمیان دخیل بنتا ہے اور اللہ کے نام پر ایک چیز کو حرام یا حلال قرار دیتا ہے، اس وجہ سے اس معاملہ میں اس کی غلطی کوئی معمولی غلطی نہیں ہے، بلکہ بعض حالات میں اس کی غلطی توحید اور شرک کا سوال پیدا کر دیتی ہے۔

اگر آج کے مفتیوں کی طرح ان کے سامنے بھی الگ الگ اماموں کی مرتب فقہیں ہوتیں اور ان کا کام صرف یہ ہوتا کہ ان کے اقوال یاد کر چھوڑیں اور بغیر اس امر کی تحقیق کیے کہ ان اقوال کی کتاب وسنت میں کوئی سند ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ کیا ہے، اور اس کی حیثیت کیا ہے، ان کو نقل کرتے پھریں، تو معاملہ بے شک آسان تھا۔ لیکن معلوم ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں نہ تو اس سہل انگاری ہی میں مبتلا ہوئے تھے اور نہ الگ الگ اماموں کی عصبیت ہی میں گرفتار ہوئے تھے، بلکہ ان کے نزدیک سب سے مقدم مسئلہ، ہر معاملہ میں، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سنت سے وابستگی کا مسئلہ تھا۔اس وجہ سے وہ اجتہاد کی مشکلات اوراس کی ذمہ داریوں سے گھبراتے تھے۔

صدر اول میں اجتہاد اور فتویٰ کا طریقہ

اس احتیاط وتقویٰ کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں پیشہ ور فتویٰ نویسوں کا وجود نہیں تھا۔صرف وہی لوگ مجبورانہ اجتہاد وفتویٰ کی ذمہ داریاں ادا کرتے تھے جن پر حکومت کی طرف سے،ان کی اہلیت کے سبب سے، یہ ذمہ داری ڈال دی جاتی تھی۔فتویٰ وقضا تو درکنار اس زمانہ میں وعظ ونصیحت کرنے کے لیے بھی ہر شخص پیش قدمی کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔اس فرض کو بھی بیش تر وہی لوگ انجام دیتے تھے جو حکومت کی طرف سے اس خدمت پر مقرر کیے جاتے تھے۔اس کے متعلق سنن ابی داؤد میں ایک روایت بھی ہے،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو وعظ کرنا امیر کا کام ہے یا اس کے مقرر کیے ہوئے نمائندے کا۔جو لوگ محض اپنی طلاقت لسانی کی نمایش کرنے اور اپنی چرب زبانی کی لوگوں پر دھاک بٹھانے کے لیے وعظ کرتے پھرتے ہیں، دراں حالیکہ وہ اس ذمہ داری سے سبک دوش ہیں،ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سخت ناپسند فرمایا ہے:

عن عوف بن مالك الأشجعي قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا يقص إلا أميرًا و مامورا و مختال. (ابوداؤد، باب فی القصص)	''عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ وعظ نہ کہے مگر امیر یا وہ شخص جو امیر کی طرف سے مامور ہو۔اور یا پھر وہ جو اپنی نمایش کا شوق رکھتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ صدر اول میں یہ اجتہادات لوگوں کے درمیان تفریق اور اختلافات پیدا کرنے کا باعث نہیں بنتے تھے۔اس زمانہ میں اول تو لوگ انفرادی طور پر اپنی رایوں کے اظہار ہی میں احتیاط برتتے تھے،ثانیاً اگر اظہار کرتے بھی تھے تو اس کی حیثیت ایک رائے سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ایک مجتہد اپنی انفرادی زندگی کی حد تک تو اپنے اجتہاد کا پابند ہوتا تھا،لیکن نہ وہ دوسروں کو اپنے اجتہاد کا پابند بنانے کی کوشش کرتا،اور نہ اپنے اجتہاد کے مقابل میں دوسروں کے اجتہاد کو غلط قرار دینے کی جرأت کرتا۔جو لوگ کسی خاص مجتہد کے اجتہادات کی پیروی کرتے، وہ بھی دوسرے مجتہدین کے اجتہادات پر چلنے والوں کو غلطی پر نہیں سمجھتے تھے۔اس طرح کے انفرادی اجتہادات،اگرچہ صحابہ ہی کے ہوں، غلطی اور صحت دونوں کے محل سمجھے جاتے تھے۔اس وجہ سے کسی کو بھی یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں تھا کہ وہی حق پر ہے اور دوسرے باطل پر ہیں۔صحابہ رضی اللہ عنہم جس معاملہ میں مختلف الرائے ہو جاتے،اس کے ہر پہلو میں غلطی اور

صحت دونوں ہی کا امکان تسلیم کیا جاتا۔

صدر اول میں اجتہاد رائے کا اصلی طریقہ یہ تھا کہ جب لوگوں کے سامنے کوئی معاملہ آتا تو اس کو امیر یا اس کے کسی مامور کے سامنے پیش کرتے اور وہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کر دیتے اور اگر معاملہ پیچیدہ ہوتا تو امیر اس کے لیے ارباب اجتہاد وتفقہ کی مجلس شوریٰ بلاتا اور اس معاملہ کو ان کے سامنے رکھتا اور پھر اجتماعی طور پر جو رائے طے پاتی اس کا اعلان کر دیا جاتا۔ یہی چیز ہے جس کو اجماع کہتے ہیں اور جس کو دین میں حجت ہونے کی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ اس طرح کے تمام فیصلے خلفاے راشدین نے خیر القرون کے ارباب علم واجتہاد کے مشورے سے کیے ہیں:

أخرج الدارمی عن المسیّب بن رافع قال کانوا إذا نزلت فیھم قصة لیس فیھا عن رسول اللّٰہ أثر إجتمعوا لھا وأجمعوا، فالحق فیما رأوا.

''دارمی نے مسیّب بن رافع سے روایت کی ہے کہ صحابہ کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ آتا جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث منقول نہ ہوتی تو وہ اس پر غور کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے اور اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے، تو جو کچھ وہ طے کر دیتے اس کو حق سمجھا جاتا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس طرح کے اجتماعی فیصلوں کی حیثیت انفرادی اجتہادات سے بالکل مختلف تھی۔ ان کو ایک مستقل شرعی حجت کا درجہ حاصل تھا۔ قاضی اور مفتی ضرورت کے وقت ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کے مطابق فتویٰ دیتے اور فیصلے کرتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ جس معاملہ میں سنت رسول اللہ سے ان کو کوئی رہنمائی نہ ملتی، اس میں وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اقوال، اگر پا جاتے تو ان کے مطابق فیصلے کر دیتے۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے فیصلے بالعموم مجلس شوریٰ کے مشورے سے ہوتے تھے اور ان کی حیثیت اجماعی فیصلوں کی ہوتی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی معاملہ میں میری سنت کے اندر کوئی ہدایت نہ ملے تو 'واجعلوہ شوریٰ بینکم ولا تقضوا فیہ برأی واحد' (اس کو شوریٰ کے ذریعہ سے طے کرو۔ انفرادی رائے سے اس کا فیصلہ نہ کرو[1])۔

عثمان غنی کے زمانہ تک مسلمانوں کا طرز عمل

اس تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ خلفاے راشدین کے زمانہ میں راے اور اجتہاد کی آزادی کے باوجود مسلمانوں کے اندر نہ تو کوئی ذہنی انتشار ہی پیدا ہوا تھا اور نہ ان کی سیاسی جمعیت ہی میں کوئی فرق آیا تھا۔ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں سب سے پہلے کتاب اللہ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اگر کتاب اللہ میں کوئی واضح رہنمائی نہ ملتی تو سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر سنت رسول اللہ میں بھی کوئی واضح ہدایت نہ ملتی تو پھر اپنے ارباب حل وعقد (اولوالامر) کے سامنے معاملہ کو پیش کرتے اور یہ ان کا کام ہوتا کہ وہ اہل علم اور اہل تقویٰ سے مشورہ کر کے یہ طے کریں کہ اس معاملہ میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مزاج سے موافق تر بات کیا ہوسکتی ہے، اور پھر جو کچھ وہ طے کر دیتے سب اسی کی پیروی کرتے۔ بات طے ہونے سے پہلے تک ہر شخص کو اس امر کی آزادی حاصل ہوتی کہ وہ اپنی راے کا پوری بے خوفی کے ساتھ اظہار کرے، لیکن جب ایک بات اجتماعی طور پر طے ہو جاتی، تو اجتماعی زندگی میں سب اسی پر کاربند ہوتے۔ اجتماعی و سیاسی زندگی کے لیے یہی ضابطہ قرآن مجید نے مسلمانوں کو سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیت میں بتایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ. (النساء ۴:۵۹)

''اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی اطاعت کرو۔ اور اگر کسی معاملہ میں اختلاف واقع ہو تو اس کے لیے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔''

اس آیت میں اللہ، رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ اگر کسی معاملہ میں اختلاف راے واقع ہو جائے تو اس کے فیصلہ کے لیے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ اختلاف، ظاہر ہے کہ دو ہی صورتوں میں واقع ہوسکتا ہے: یا تو یہ ہوگا کہ اس امر کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول میں کوئی ہدایت سرے سے موجود ہی نہیں ہوگی یا ہدایت تو موجود ہوگی، لیکن اس میں تاویل کے مختلف پہلو ہو سکتے ہوں گے۔ ان دونوں صورتوں میں قرآن مجید کی ہدایت یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ یعنی اگر اختلاف تاویل کی نوعیت کا ہے تو وہ تاویل اختیار کی جائے جس

---

۱ بعض لوگوں نے اس روایت پر شبہ کیا ہے۔ ممکن ہے نقطاً یہ روایت صحیح نہ ہو، لیکن خلفاے راشدین کا عمل اس روایت کے مفہوم کی تصدیق کرتا ہے۔

کی تائید کتاب وسنت کے دوسرے نظائر سے ہو رہی ہو اور اگر معاملہ کا تعلق اجتہاد سے ہو تو اجتہاد میں یہ بات دیکھی جائے کہ زیر بحث معاملہ میں خدا کی شریعت کے مزاج سے قریب تر بات کیا ہو سکتی ہے، اور جو بات قریب تر نظر آئے وہ اختیار کر لی جائے۔

اس آیت میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں:

ایک یہ کہ اس میں اطاعت کا حکم تو تین کے لیے دیا گیا ہے ـــــ اللہ، رسول اور اولوالامر۔ اس لیے کہ سیاسی نظام اس وقت تک وجود میں آ ہی نہیں سکتا جب تک اللہ ورسول کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بھی اطاعت نہ کی جائے جو خدا اور رسول کی شریعت نافذ کرنے والے ہوں۔ لیکن اختلاف واقع ہونے کی صورت میں رجوع کرنے کا حکم صرف اللہ اور رسول ہی کی طرف دیا گیا ہے، اولوالامر کو اس سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون کا مصدر صرف اللہ اور رسول ہی ہیں۔ اولوالامر نہ قانون کا مصدر ہیں اور نہ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی قدم خدا اور اس کے رسول سے بے نیاز ہو کر اٹھائیں۔ بلکہ اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں اللہ ورسول کی طرف رجوع کرنے کا جو حکم مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے، وہ حکم دراصل اولوالامر ہی کو دیا گیا ہے، کیونکہ نظام سیاسی کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے یہ انھی کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو خدا اور رسول کے راستہ پر چلائیں اور اگر کوئی ایسا موڑ آ جائے جہاں اس امر کے تعین میں اختلاف ہو سکتا ہو کہ خدا کی راہ کون سی ہے تو وہاں خدا کی شریعت کے اشارات سے فائدہ اٹھا کر صحیح سمت کا تعین کریں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوسری یہ کہ 'اَطِیْعُوْا' (اطاعت کرو) کا لفظ اللہ اور رسول، دونوں کے لیے الگ الگ آیا ہے، لیکن اولوالامر کے لیے اس لفظ کو نہیں دہرایا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت تو مستقل اور غیر مشروط ہے، لیکن اولوالامر کی اطاعت مستقل اور غیر مشروط نہیں ہے، بلکہ وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کے احکام اللہ اور رسول کے احکام کے تحت ہوں۔

یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے زمانہ تک مسلمانوں کا طرز عمل یہی رہا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ''ازالۃ الخفاء'' میں لکھتے ہیں:

''وعظ وفتویٰ موقوف بود بررائے خلیفہ بدون امر خلیفہ وعظ نمی گفتند وفتویٰ نمی دادند۔ واخیراً بغیر توقف بررائے خلیفہ وعظ می گفتند وفتویٰ دادند ودریں وقت مشاورت	''اس زمانہ تک وعظ اور فتویٰ خلیفہ کی رائے پر موقوف تھا۔ خلیفہ کے حکم کے بغیر نہ وعظ کہتے تھے اور نہ فتویٰ دیتے تھے۔ بعد میں خلیفہ کے حکم کے بغیر وعظ

جماعت درفتویٰ موقوف ماند.........وتحقیق آنست کہ تا زمان حضرت عثمان اختلاف مسائل فقیہ واقع نمی شد درمحل اختلاف بخلیفہ رجوع می کردند و خلیفہ بعد مشاورت امرے اختیار می کرد و ہماں امر مجمع علیہ می شد۔ وبعد وجود فتنہ ہر عالمے برائے خود فتویٰ مے داد و دریں زمانہ اختلاف واقع شد۔ وآنچہ شہرستانی درکتاب ملل ونحل گفتہ کہ بمجرد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اختلاف پدید آمد خطا است ۔ اختلاف آن نیست کہ دراثنائے مشاورت اقوال متغائرہ گوئند د بالآخر امرے منقح شود و برہماں امر اجماع کنند۔ اختلاف آنست کہ ہر دو قول مستقر پیدا شود و ہر یکے بجانب خود و ہدم وضع مخالف خواہد .... ومفسدۂ عظیم کہ برآں مترتب گشت آنست کہ طبقات متاخرین ایں تغیر را بہیئتہا وصفاتہا سنت خیال کردند ازیں جہت کہ اصل او ماخوذ از سنت بود و لائمہ قائم نمودند برتارک آں ومقصر درآں۔‘‘

کہنے اور فتویٰ دینے لگے اور فتویٰ کے معاملہ میں جماعت کے مشورہ کی جو صورت پہلے تھی وہ باقی نہ رہی.........تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمان کے زمانہ تک فقہی اختلافات برپا نہیں ہونے پائے تھے۔ جب کوئی اختلافی صورت نمودار ہوتی، خلیفہ کے سامنے معاملہ پیش کرتے، خلیفہ اہل علم وتقویٰ سے مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرتا اور وہی سب لوگوں کی اجماعی رائے بن جاتی۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ہر عالم بطور خود فتوے دینے لگا اور اس طرح مسلمانوں میں اختلاف برپا ہوا۔ اور شہرستانی نے اپنی کتاب ملل ونحل میں یہ جو لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی فقہی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اختلاف اس چیز کو نہیں کہتے کہ مشورہ کے دوران میں لوگ رایوں کا اظہار کریں یہاں تک کہ ایک منقح بات بالآخر طے ہو جائے اور لوگ اس پر اجماع کرلیں۔ اختلاف یہ ہے کہ کسی امر میں دو مستقل قول پیدا ہو جائیں اور ہر قول اپنی اپنی جگہ پر اس امر کا مطالبہ کرے کہ وہی باقی رہے اور دوسرا مٹ جائے.........سب سے بڑی خرابی جو اس صورت حال سے نمودار ہوئی، وہ یہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے ان اختلافات کو محض اس خیال کی بنا پر کہ اگلوں نے جو کچھ کہا ہوگا، سنت نبوی ہی سے اخذ کر کے کہا ہوگا، سنت کا درجہ دے دیا اور جن کو ان کا تارک پایا یا جن کو ان کے معاملہ میں کوتاہی کرنے والا دیکھا، ان پر ترک سنت کا الزام دھرنے لگے۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ جب تک اسلامی نظام اپنی اصلی صورت میں قائم رہا اس وقت تک امت میں اگرچہ ہر قسم کے فقہی اختلافات پیدا ہوتے تھے، اہل علم ان اختلافات پر پوری آزادی کے ساتھ بحثیں بھی کرتے تھے، لیکن یہ اختلافات مسلمانوں کے اندر انتشار اور تفریق پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتے تھے، کیونکہ ہر اختلاف بالآخر خلیفہ کے سامنے پیش ہوتا اور وہ اس کے بارے میں اپنی مجلس شوریٰ سے مشورہ کر کے کوئی منقح بات طے کر دیتا جس کو سب تسلیم کر لیتے۔ اور اگر اس طرح کے فیصلہ سے کسی خاص شخص کو اختلاف بھی ہوتا، تو اس اختلاف کی حیثیت صرف ایک رائے کی ہوتی۔ قضا اور فتویٰ کے سارے معاملات خلیفہ اور مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ہی انجام پاتے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

حرثان بن قیس حضرت عکاشہ بن محصن کے دادا تھے۔ حضرت عکاشہ کے چھٹے جد غنم بن دودان کی نسبت سے ان کا قبیلہ بنوغنم بن دودان، ساتویں جد اسد بن خزیمہ کے نام پر بنواسد اور آٹھویں جد کی وجۂ تسمیہ سے بنوخزیمہ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عکاشہ اسدی اور غنمی، دونوں نسبتوں سے جانے جاتے ہیں۔ ابومحصن ان کی کنیت تھی۔ حضرت عکاشہ بنوعبد شمس (بنوامیہ) کے حلیف تھے۔

حضرت عکاشہ بن محصن قرآن مجید کے بیان کردہ صاحب فضیلت اصحاب رسول السابقون الاولون (التوبہ ۹: ۱۰۰) میں سے تھے۔

۱۰؍نبوی میں حج کے موقع پر یثرب کے کچھ زائرین مشرف بہ اسلام ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کے ستائے ہوئے اہل ایمان کو اس شہر کی طرف ہجرت کا اذن دے دیا۔ ابوسلمہ کو پہلے مہاجر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۱؍نبوی میں بیعت عقبۂ اولیٰ ہوئی اس کے بعد حضرت عامر بن ربیعہ اور ان کی اہلیہ لیلیٰ مدینہ پہنچے۔ بنوغنم بن دودان (بنواسد بن خزیمہ) کے مردوں، عورتوں نے ہجرت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن جحش، ان کی اہلیہ حضرت فاطمہ، بھائی ابواحمد، ہمشیرگان زینب، حمنہ، ام حبیب اور بیٹے محمد کے آنے کے بعد ان کے اعزہ کے کئی خاندان بھی مدینہ پہنچ گئے۔ ان کے نام یہ ہیں: حضرت عکاشہ بن محصن، ان کے بھائی ابوسنان، عمرو اور ہم شیر ام قیس، شجاع بن وہب، ان کے بھائی عقبہ، اربد بن حمیر، سنان بن ابوسفیان، منقذ بن نباتہ، سعید بن رقیش، ان کے بھائی یزید اور بہن آمنہ، محرز بن نضلہ، قیس بن جابر، مالک بن عمرو، ان کے بھائی صفوان اور ثقف، ربیعہ بن اکثم، تمام بن عبیدہ

اوران کے بھائی سخبرہ اورزبیر۔ یہ سب قبا میں قبیلۂ بنوعمرو بن عوف کے مبشر بن عبدالمنذر کے ہاں مقیم ہوئے۔ مواخات کا وقت آیا تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجذر بن زیاد کو حضرت عکاشہ کا انصاری بھائی قرار دیا۔

رجب ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو مہاجرین پر مشتمل ایک سریہ روانہ فرمایا جو سریۂ عبداللہ بن جحش کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عبداللہ کے علاوہ حضرت عکاشہ بن محصن، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ، حضرت عتبہ بن غزوان، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت واقد بن عبداللہ، حضرت خالد بن بکیر اور حضرت سہیل بن بیضا اس میں شامل تھے۔ امیر سریہ حضرت عبداللہ کو آپ نے ایک خط دیا اور فرمایا کہ مدینہ سے مکہ کی جانب دو دن کا سفر کر لینے کے بعد وادئ ملل پہنچ کر اسے پڑھنا، کسی ساتھی کو زبردستی آگے نہ لے کر جانا۔ فرمان نبوی کے مطابق انھوں نے اٹھائیس میل کی مسافت طے کر لی تو خط کھولا۔ اس میں لکھا تھا: ''مکہ اور طائف کے بیچ واقع مقام نخلہ کی طرف سفر جاری رکھو، وہاں پہنچ کر قریش کی نگرانی کرو اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہمیں خبر دو۔'' حضرت عبداللہ نے شرکا سے کہا: جو شہادت کا طلب گار ہے، وہی آگے چلے۔ سب چل پڑے، کوئی پیچھے نہ رہا۔ بحران کے مقام پر حضرت عتبہ بن غزوان اور حضرت سعد کا مشترکہ اونٹ کھو گیا اور وہ اسے تلاش کرنے لگ گئے، ابن جحش باقی ساتھیوں کو لے کر نخلہ پہنچ گئے۔ کشمش، کھالیں، شراب اور دوسرا سامان تجارت لے کر چار افراد پر مشتمل قریش کا قافلہ آیا اور اسی جگہ قیام کیا جہاں دستہ ٹھیرا ہوا تھا۔ مسلمانوں کو دیکھ کر کفار خوف زدہ تھے۔ حضرت عکاشہ نے ایک تدبیر کی، وہ سر منڈا کر ان کے سامنے آئے جس سے انھیں اطمینان ہو گیا۔ انھوں نے کہا: یہ عمرہ کرنے جا رہے ہیں، ہمارے لیے حرج کی کوئی بات نہیں۔ مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ قافلے والوں کو آج کی رات چھوڑ دیا تو یہ حدود حرم میں داخل ہو کر مامون ہو جائیں گے اور اگر قتال کیا تو یہ حرام مہینے میں ہو گا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد انھوں نے حملے کا فیصلہ کیا۔ حضرت واقد بن عبداللہ نے تیر مار کر قافلے کے سردار عمرو بن حضرمی (حضرمی نسبت ہے، اصل نام عبداللہ تھا) کو قتل کر دیا، عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قید کر لیا گیا۔ چوتھا فرد نوفل بن عبداللہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ہجرت مدینہ کے بعد بھیجے جانے والے سات سریوں میں سے یہ پہلا سریہ تھا جس میں کامیابی ملی۔ ابن حضرمی عہد اسلامی کا پہلا قتیل اور عثمان اور حکم پہلے اسیر تھے۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے تاریخ اسلامی کے اولیں مال غنیمت کی اپنے طور پر تقسیم کی اور ۱/۵ حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رکھ لیا، حالاں کہ خمس کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ قرآن مجید نے اس قتال اور تقسیم کو جائز قرار دیا ہے (البقرہ ۲: ۲۱۷۔ الانفال ۸: ۴۱)۔ سریۂ عبداللہ بن جحش اس لحاظ سے اہم تھا کہ اس سے قریش کی شام سے تجارت متاثر ہوئی۔ ان کی خوش حالی کا دارومدار اسی تجارت پر تھا۔ عمرو بن

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حضرمی کے قتل کا بدلہ لینے کا جنون ان پر اس قدر سوار ہوا کہ وہ بدر کی جنگ لڑنے پر تیار ہو گئے۔

جنگ بدر میں حضرت عکاشہ بن محصن نے خوب جوہر دکھائے۔ان کی تلوار ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکڑی کی ایک ٹہنی (یا کھجور کی شاخ) پکڑا دی اور فرمایا: عکاشہ، اس سے لڑو۔آپ کے دست مبارک سے ٹہنی لے کر انھوں نے خوب گھمائی تو وہ سفید لوہے کی مضبوط پھل والی لمبی تلوار میں بدل گئی۔حضرت عکاشہ اسی تلوار سے لڑے حتیٰ کہ اللہ نے مسلمانوں کو فتح مبین دی۔اس تلوار کو 'عون' کے نام سے پکارا جانے لگا۔باقی تمام غزوات میں یہی حضرت عکاشہ کے پاس رہی۔اپنے آخری معرکہ 'جنگ بزاخہ' میں بھی وہ اسی تلوار کو لے کر گئے، لیکن استعمال کی نوبت نہ آئی۔انھوں نے طلیحہ کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔اسی نوعیت کا معجزہ جنگ احد میں مکرر رونما ہوا۔جب عبداللہ بن جحش کی تلوار ٹوٹی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کھجور کی ٹہنی عنایت فرمائی۔ٹہنی کا اگلا حصہ تلوار کی شکل اختیار کر گیا، جبکہ دستہ کھجور ہی کا رہا۔جنگ بدر میں حصہ لینے والے مشرک معاویہ بن عامر کو سیدنا علی نے قتل کیا، تاہم ابن ہشام کی روایت ہے کہ اسے انجام تک پہنچانے والے حضرت عکاشہ بن محصن تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عکاشہ بن محصن نے جنگ احد اور جنگ خندق میں بھی حصہ لیا۔

غزوۂ ذی قرد (یا غزوۂ غابہ، جنگل میں ہونے والا معرکہ): اصحاب مغازی کی رائے میں ربیع الاول یا شعبان ۶ھ میں، جبکہ امام بخاری کے قول کے مطابق ذی الحجہ ۶ھ میں ہوا۔آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ واپس تشریف لائے تو اپنی بیس اونٹنیاں رباح غلام کو دے کر چرنے کے لیے ذوقرد بھیج دیں۔یہ مدینہ اور خیبر کے درمیان دو دن کی مسافت پر جنگل میں واقع ایک چشمہ ہے۔راتوں رات بنوغطفان (بنوفزارہ) کے عبدالرحمان بن عیینہ نے چالیس آدمیوں کے ساتھ غارت گری کی۔حضرت ابوذر غفاری کے صاحب زادے کو جو حفاظت پر مامور تھے، قتل کیا، ان کی بیوی کو اغوا کیا اور تمام اونٹنیاں ہنکا کر لے گئے۔حضرت سلمہ بن اکوع کو سب سے پہلے اس واقعے کا علم ہوا، وہ اپنی تیر کمان لے کر طلحہ بن عبیداللہ کے گھوڑے پر، ان کے غلام کے پیچھے بیٹھ کر جنگل میں پہنچے تھے۔گھوڑا انھوں نے رباح کو دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کرنے کے لیے مدینہ بھیج دیا، خود دوڑ کر حملہ آوروں کو جا لیا اور ان پر تیر برسانے شروع کر دیے۔کبھی درخت کی آڑ لے کر تیر مارتے، کبھی پہاڑی یا ٹیلے پر چڑھ کر پتھر پھینک دیتے۔اس طرح انھوں نے ایک ایک کر کے پوری بیس اونٹنیاں چھڑا لیں۔غطفانی بھاگ نکلے، جاتے جاتے تیس سے زیادہ نیزے اور چادریں پھینک گئے۔پسپا ہوتے ہوتے وہ گھاٹی کے تنگ مقام تک آئے تھے کہ عیینہ بن حصن (عیینہ بن بدر) کمک کو آن پہنچا۔اسی اثنا میں حضرت سعد بن زید کی سربراہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھیجا ہوا

دستہ بھی آ گیا جس میں حضرت مقداد بن عمرو (اسود)، حضرت عباد بن بشر، حضرت عکاشہ بن محصن، حضرت محرز بن نضلہ (اخرم)، حضرت ابوقتادہ، حضرت ابوعیاش اور حضرت اسید بن ظہیر شامل تھے۔ فریقین میں پھر جھڑپ ہوئی۔ حضرت محرز (اخرم) حضرت عکاشہ بن محصن کے گھوڑے 'جناح' پر سوار تھے۔ انھوں نے عبدالرحمان بن عیینہ کے گھوڑے کو مار ڈالا تو عبدالرحمان (شاذ روایت: مسعدہ) نے انھیں شہید کر دیا اور خود ان کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر حضرت ابوقتادہ آئے اور عبدالرحمان بن عیینہ (اور مسعدہ) کو جہنم رسید کیا۔ حضرت مقداد نے حبیب بن عیینہ اور قرفہ بن مالک کو قتل کیا۔ حضرت عکاشہ بن محصن نے اوبار (اثار: ابن سعد، اوثار: واقدی) اور اس کے بیٹے عمرو کو انجام تک پہنچایا۔ باپ بیٹا ایک اونٹ پر سوار تھے، حضرت عکاشہ نے ان دونوں کو اکٹھا نیزے میں پرو لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پانسو صحابہ کے ساتھ ذوقرد پہنچے اور پہاڑ کے دامن میں ایک دن قیام کیا۔ آپ نے صحابہ میں سو اونٹنیاں تقسیم فرمائیں۔ سیدنا بلال نے ایک اونٹنی ذبح کر کے اس کی کلیجی اور کوہان بھون کر آپ کو پیش کی۔

سریۂ عکاشہ: ربیع الاول ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عکاشہ بن محصن کی قیادت میں چالیس اصحاب کا ایک سریہ بنو اسد بن خزیمہ کے علاقے غمر مرزوق (مدینہ سے نجد کی طرف جانے والے راستے پر واقع ایک مقام) کی طرف روانہ فرمایا۔ حضرت ثابت بن اقرم اور حضرت شجاع بن وہب اس میں شامل تھے۔ ۳ھ میں ابوسلمہ کی قیادت میں ایک سریہ پہلے بھی اسی قبیلہ کی طرف قطن جا چکا تھا۔ حضرت عکاشہ کی تیز رفتاری کے باوجود غنیم متنبہ ہو کر بھاگ نکلا۔ غمر کے چشموں پر ڈیرا ڈال کر انھوں نے شجاع کو معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تو پتا چلا کہ اہل قبیلہ اپنے گھروں کو خالی کر کے جا چکے ہیں اور دو سو اونٹ پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ حضرت عکاشہ انھیں مدینہ ہانک لائے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ربیع الثانی ۹ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عکاشہ بن محصن اسدی کو ایک سریہ کے ساتھ عذرہ اور بلی قبائل کی سرزمین جناب کی طرف روانہ فرمایا۔ ان قبائل کے کچھ لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ اس سریہ کی غرض و غایت اور مزید تفصیلات نقل نہیں ہوئیں۔

۱۱ھ میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر فوج لے کر ذوالقصہ پہنچے، تیاریاں مکمل کیں اور حضرت خالد بن ولید کو پونے تین ہزار کی نفری کا سپہ سالار مقرر کر کے بزاخہ کی طرف روانہ کیا۔ بنو اسد کے اس چشمے پر مدعیٔ نبوت طلیحہ نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، بنو اسد، بنو غطفان (بنو فزارہ) اور بنو طے کے کچھ لوگ اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ حضرت خالد نے حضرت عکاشہ بن محصن اور حضرت ثابت بن اقرم انصاری کو دشمن کی جاسوسی کرنے کے لیے آگے بھیجا۔ حضرت عکاشہ رزام نامی گھوڑے اور حضرت ثابت محبر پر سوار قطن پہنچے۔ طلیحہ اور اس کا بھائی سلمہ چوکسی کر رہے تھے۔ سلمہ نے

ثابت کو دیکھ لیا اور اسی وقت شہید کر دیا، پھر آواز دے کر طلیحہ کو بلایا اور دونوں نے مل کر حضرت عکاشہ کی جان بھی لے لی۔ دوسری روایت ہے کہ حضرت عکاشہ نے طلیحہ کے بیٹے حبال یا جبال (ابن کثیر یا اس کے بھائی: ابن اثیر) کو جہنم رسید کیا تو طلیحہ نے انھیں شہید کیا۔ حضرت ثابت کی میت کا پتا نہ چلا اور وہاں پہنچنے والے اپنے ہی سپاہیوں کے گھوڑوں تلے روندی گئی۔ مسلمان ٹھٹک کر رکے تو حضرت عکاشہ کو بھی شہید ہوا پایا۔ حضرت ابوواقد لیثی جو حضرت زید بن خطاب کی سربراہی میں دوسو گھڑ سواروں کے مقدمۃ الجیش میں شامل تھے اور حضرت عکاشہ اور حضرت ثابت ان کے آگے آگے چل رہے تھے، بیان کرتے ہیں کہ ہم ان دونوں کی جاے شہادت پر پہنچے تو جی بہت برا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد حضرت خالد بھی فوج لے کر آن پہنچے۔ سب کو بہت رنج تھا کہ بڑا مقام رکھنے والے دو شہ سوار مسلمان ان سے جدا ہو گئے ہیں۔ حضرت خالد نے قبر کھدوا کر دونوں شہیدوں کو خون آلود کپڑوں سمیت دفن کرایا۔ حضرت عکاشہ کے جسم پر کئی زخم تھے۔

حضرت خالد نے سپاہیوں کو رنجیدہ دیکھا تو بنو طے کی طرف کوچ کیا اور ان سے مدد چاہی۔ عدی بن حاتم طائی زکوٰۃ ادا کر کے مدینہ سے لوٹے تھے، انھوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو اسلام کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اہل قبیلہ مان گئے تو انھوں نے حضرت خالد بن ولید سے تین دن کی مہلت مانگی، اس دوران میں طلیحہ کے لشکر میں موجود اپنے پانسو آدمیوں کو واپس بلا لیا۔ بنو جدیلہ کے ایک ہزار سوار بھی مرتدوں کو چھوڑ کر جیش خالد میں شامل ہو گئے۔ جنگ بزاخہ شروع ہوئی تو عیینہ بن حصن اپنے سات سو سپاہیوں کے ساتھ آگے آیا۔ طلیحہ چادر اوڑھے آمد وحی کا ڈھونگ رچائے رہا، جبکہ بنو عامر اس انتظار میں تھے کہ جس فریق کا پلڑا بھاری ہو، اس کا ساتھ دیں۔ اسلامی لشکر کا دباؤ بڑھا تو عیینہ نے اپنی قوم کو پکارا، بنوفزارہ، (غطفان کے چوتھے جد سے نسبت) طلیحہ کذاب ہے، بھاگ کر اپنی جانیں بچاؤ۔ طلیحہ اپنی بیوی نوار کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا، وہ شام پہنچا اور بنو کلب میں سکونت اختیار کر لی۔ بنو اسد، بنو غطفان (بنوفزارہ) اور بنو عامر مسلمان ہو گئے تو وہ بھی اسلام لے آیا۔ عمرہ کرنے مکہ گیا، مدینہ کے نواح سے گزرا، لیکن سیدنا ابوبکر نے تعرض نہ کیا۔ حضرت عمر کے خلافت سنبھالنے کے بعد پھر آیا اور بیعت کے لیے پیش ہوا۔ سیدنا عمر نے کہا: تو حضرت عکاشہ اور حضرت ثابت کا قاتل ہے، میں تمھیں کبھی پسند نہ کروں گا۔ اس نے جواب دیا: حضرت عکاشہ نے میری وجہ سے سعادت حاصل کر لی اور میں بد بخت ٹھہرا، اب میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔ امیر المومنین، یہ کفر کے فتنے تھے، قبول اسلام نے ان کو زائل کر دیا ہے۔ تب سیدنا عمر خاموش ہو گئے۔ حضرت عکاشہ کی شہادت ایسا سانحہ تھا جو اہل ایمان کے دلوں میں کھٹکتا رہا۔ ۱۴ھ میں جنگ قادسیہ ہوئی تو طلیحہ اسلامی فوج میں شامل تھے۔ سپہ سالار

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایرانی لشکر کی جاسوسی کرنے کے لیے حضرت عمرو بن معدی کرب اور حضرت طلیحہ کی قیادت میں پانچ پانچ افراد کے دو گروپ بھیجے۔ حضرت عمرو نے کچھ معلومات حاصل کر کے لوٹنا چاہا، انھوں نے حضرت طلیحہ کو بھی ساتھ چلنے کو کہا، لیکن وہ لشکر کے اندر گھس گئے اور ایرانیوں کا ایک اعلیٰ قسم کا گھوڑا اڑا لائے، ایرانی فوج کے دو جنگ جوؤں کو مار ڈالا اور ایک کو قید کر لیا۔ بعد میں اس بہادری کی داد بھی ملی، لیکن حضرت عمرو نے مشورہ نہ ماننے پر انھیں حضرت عکاشہ بن محصن کے قاتل ہونے کا طعنہ دے ڈالا۔

حضرت عکاشہ کی شہادت کے بارے میں مشہور روایت یہی ہے جو اوپر درج ہوئی، تاہم سلیمان تیمی کا خیال ہے کہ حضرت عکاشہ اور حضرت ثابت بن اقرم سریۂ بنوخزیمہ (۱۲ھ) میں طلیحہ ہی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ابن اثیر نے اسے غلط اور وہم قرار دیا ہے۔

حضرت عکاشہ کی بہن ام قیس بنت محصن بیان کرتی ہیں کہ یوم نحر (۱۰ ذی الحجہ) کی شام حضرت عکاشہ میرے ہاں سے بنو اسد کے کچھ لوگوں کے ساتھ نکلے تو انھوں نے قمیصیں پہن رکھی تھیں (یعنی احرام کھول دیا تھا)۔ رات کے وقت یہ لوگ واپس آئے تو قمیصیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا: عکاشہ، کیا بات ہے، تم قمیصیں پہن کر گئے تھے اور اب ہاتھوں میں پکڑ کر لوٹے ہو؟ انھوں نے بتایا: (ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ کے ارشاد کے مطابق) آج جب ہم شیطانوں کو کنکریاں مار لیں گے (اور قربانی کر کے سر منڈا لیں گے)، ہمارے لیے ہر وہ شے حلال ہو جائے گی جسے حالت احرام میں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ہاں ہمیں اپنی بیویوں کے پاس جانے کی اجازت تب ملے گی جب ہم طواف افاضہ (بیت اللہ کا طواف جو حاجی یوم نحر کو منیٰ سے مکہ جا کر کرتے ہیں اور پھر منیٰ لوٹ آتے ہیں) کر لیں گے۔ آج کی شب ہم نے طواف افاضہ نہیں کیا اور حالت احرام میں ہیں، اس لیے قمیصیں اتار لی ہیں جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو (ابوداؤد، رقم ۱۹۹۹۔ احمد، رقم ۲۶۴۱۰)۔ قوسین میں لکھی گئی وضاحت کی تائید مسند احمد کی اسی روایت کے اوپر والے اس حصے سے ہوتی ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہب بن زمعہ کو قمیص اتارنے اور احرام برقرار رکھنے کا حکم دیا تھا، کیونکہ انھوں نے بھی طواف افاضہ کرنے سے پہلے ہی احرام کھول دیا تھا۔

حضرت ام قیس بتاتی ہیں کہ میرا بیٹا فوت ہوا تو میں نے بہت آہ وزاری کی۔ اسی حالت اضطراب میں غسل دینے والے کو کہہ دیا کہ میرے بیٹے کو ٹھنڈے پانی سے غسل دے کر مار نہ دینا۔ حضرت عکاشہ بن محصن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے تو یہ بات آپ کو بتائی۔ آپ مسکرائے اور فرمایا: اللہ اس کی عمر دراز کرے، یہ کیا کہا؟ راوی کہتے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہیں کہ (آپ کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ) ہمارے علم میں نہیں کہ کسی عورت کی عمر حضرت ام قیس سے زیادہ ہوئی ہو (نسائی، رقم ۱۸۸۳۔ احمد، رقم ۲۶۸۷۸)۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا: (معراج کی رات، ایام حج میں یا خواب میں) مجھے گذشتہ امتیں دکھائی گئیں، نبی ایک ایک کر کے گزرنے لگے، امت ساتھ ہوتی۔ کچھ نبی گزرے تو ایک گروہ ان کے ساتھ تھا، کچھ آئے تو دس افراد ساتھ تھے، ایک نبی پانچ امتیوں کو لے کر گزرے، ایک اکیلے ہی گزر گئے۔ اچانک میں نے ایک جم غفیر دیکھا تو پوچھا: جبریل علیہ السلام، کیا یہ میری امت ہے؟ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: نہیں، (بخاری ہی کی روایت، رقم ۵۷۰۴ میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم ہے) اور کہا: آپ افق کی طرف دیکھیں۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو ایک بہت بڑا مجمع نظر آیا۔ تب انھوں نے بتایا: یہ آپ کی امت ہے۔ (دوسری روایت میں ہے کہ مجھے کہا گیا کہ اپنے دائیں طرف دیکھیں تو میں نے دیکھا کہ لوگوں کی کثرت سے پہاڑوں کا رستہ بند ہو گیا ہے۔ پھر آواز آئی کہ اپنے بائیں طرف تو دیکھیں۔ مجھے نظر آیا کہ افق (حد نگاہ) لوگوں سے پر ہو گیا ہے۔ تب سوال ہوا کہ کیا آپ راضی ہو گئے ہیں؟ میں نے کہا: میں خوش ہو گیا ہوں، یا رب، میں راضی ہو گیا ہوں (احمد، رقم ۳۸۰۶)۔ پھر بتایا گیا کہ ان کے آگے آگے یہ ستر ہزار افراد ایسے ہیں جن کا کوئی حساب ہو گا نہ ان پر عذاب آئے گا۔ (ان کے چہرے چاند کی طرح چمک رہے تھے (بخاری، رقم ۵۸۱۱)۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دغواتے نہ منتر کراتے نہ شگون لیتے تھے، یہ تو اپنے رب پر بھروسا کرتے تھے۔ (اس موقع پر) حضرت عکاشہ بن محصن کھڑے ہو گئے اور کہا: اللہ سے دعا فرمائیں، مجھے بھی ان میں شامل کر دے۔ آپ نے دعا فرمائی: ''اللہ، عکاشہ کو ان میں شامل کر دے۔'' اب ایک اور شخص (دوسری روایت: انصاری صحابی) نے کھڑے ہو کر التجا کی: ''اللہ سے دعا کریں، میرا شمار بھی ان لوگوں میں ہو جائے۔'' آپ نے فرمایا: ''اس بات میں عکاشہ تم پر سبقت لے گیا ہے۔'' (بخاری، رقم ۶۵۴۱۔ مسلم، رقم ۴۴۷)۔ آپ کا فرمایا ہوا یہ جملہ ضرب المثل بن گیا ہے، ایک آدمی دوسرے پر سبقت لے جائے تو کہا جاتا ہے: 'سبقك بها عكاشة'۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں سے جو پہلا گروہ جنت میں داخل ہو گا، ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح (روشن) ہوں گے۔ ان کے بعد جانے والے آسمان کے سب سے خوب صورت ستارے کی طرح چمکتے ہوں گے۔ اس موقع پر حضرت عکاشہ بن محصن اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ، اللہ سے دعا فرمائیں کہ مجھے ان میں شامل کر دے۔ آپ نے دعا کی: اللہ، اسے ان میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شامل کر دے۔ پھر ایک اور شخص اٹھا اور کہا: یارسول اللہ، اللہ سے دعا فرمائیں کہ میرا شمار بھی ان میں کر دے۔ آپ نے فرمایا: ''عکاشہ اس باب میں تم پر سبقت لے گیا ہے۔'' (احمد، رقم ۱۰۴۷۲)۔ شارحین نے بتایا ہے کہ بعد میں اٹھنے والے انصاری صحابی حضرت سعد بن عبادہ تھے، جبکہ حضرت ابوعمر کہتے ہیں کہ لامحالہ وہ شخص صحابی نہیں، بلکہ منافق ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بھی کچھ مانگا گیا، آپ نے حتی الامکان انکار نہیں کیا۔

حضرت عکاشہ کا شمار انتہائی خوب صورت صحابہ میں ہوتا ہے۔ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: ''عرب کا بہترین شہ سوار ہمارے ساتھ شامل ہے۔'' حاضرین نے پوچھا: ''کون ہے وہ یارسول اللہ؟'' فرمایا: ''عکاشہ بن محصن۔'' حضرت ضرار بن اسود نے کہا: ''وہ تو ہمارے ہی آدمی ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''تمھارے ہی نہیں، ہم سب کے۔''

حضرت عکاشہ بن محصن کی عمر چوالیس (یا پینتالیس) برس ہوئی۔ حضرت ام قیس بنت محصن بتاتی ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت عکاشہ چوالیس برس کے تھے۔ جنگ بزاخہ ایک سال بعد ہوئی جس میں ان کی شہادت ہوئی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت عکاشہ سے حدیث روایت کی۔ حدیث کی تین کتابوں میں ان کی مرویات موجود ہیں۔

ہندوستان کے صوبہ کیرالا کے شہر اریٹو پٹا (Erattupetta) میں رہنے والے لبی (Lebbas) مسلمان اپنے آپ کو حضرت عکاشہ بن محصن کی اولاد بتاتے ہیں۔ حضرت عکاشہ کی نسل سے تعلق رکھنے والے سعید باوا ان کے جد امجد تھے۔ انیسویں صدی عیسوی میں اسرائیل کے شہر یروشلم (بیت المقدس) میں ایک مسجد تعمیر کی گئی جسے حضرت عکاشہ بن محصن سے منسوب کیا گیا۔ یہ مسجد اب ویران ہے۔ مسجد کے قریب بارہویں صدی کا تعمیر کردہ ایک مقبرہ ہے جس میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے سپاہی مدفون ہیں۔ اس مقبرے کو مقبرۂ بنی عکاشہ بن محصن کہا جاتا ہے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

رضوان اللہ

قوّامیت کے تقاضے

شوہر بیویوں کے سربراہ ہیں اوران کی سربراہی کی وجہ ان کی خداداد صلاحیت اوران پر عائد کردہ بیویوں کے نان و نفقہ کی ذمہ داری ہے، یہ سب بیان کردینے کے بعد اب یہ بتایا ہے کہ وہ کون سی دو باتیں ہیں جو اس سربراہی کے لازمی تقاضوں کی حیثیت سے بیویوں پر لازم آتی ہیں۔ فرمایا ہے: 'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ[1]' (پھر جو نیک عورتیں ہیں، وہ فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے)۔ سربراہی کے ان تقاضوں کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا تھا: مرد چونکہ سربراہ ہیں، اس لیے عورتیں اُن کی اطاعت اوران کے رازوں کی حفاظت کریں۔ لیکن اس سادہ اسلوب کے بجاے ان تقاضوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: مرد چونکہ سربراہ ہیں، اس لیے جو نیک عورتیں ہیں وہ اُن کی اطاعت گزار ہوتیں اوران کے رازوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی اس اسلوب میں محض حکم ہی نہیں، اس حکم کے لیے ایک طرح کی ترغیب بھی بیان ہوئی اوراس کے ساتھ ساتھ یہ مدعا بھی بیان ہوگیا کہ مرد کی اطاعت اوراس کے رازوں کی حفاظت بہرحال نیک عورتیں ہی کیا کرتی ہیں۔

اب ذیل میں قوامیت کے ان دونوں تقاضوں اوران پر اٹھنے والے سوالات کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

---

[1] یہ دونوں چیزیں قوامیت کے تقاضے ہی ہیں، اس کی دلیل اس جملے کے شروع میں آنے والا حرف 'ف' ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پہلا تقاضا

'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ': اس جملے میں ایک لفظ قنوت استعمال ہوا ہے کہ جس کا لغوی معنی اطاعت کرنا اور فرماں بردار ہونا ہے۔ یہاں یہ لفظ چونکہ عورتوں کے لیے آیا اور خاص مردوں کی سربراہی کے ایک تقاضے کے طور پر آیا ہے، اس لیے اس کا معنی ان عورتوں کا اپنے مردوں کی اطاعت کرنا اور انھی کی فرماں بردار ہونا ہے۔ مزید یہ کہ اس اطاعت کا ذکر مردوں کی اُس سربراہی کے ذیل میں آیا ہے جو بطور شوہر انھیں حاصل ہوئی ہے، اس لیے اس سے مراد لازمی طور پر مردوں کے ہر حکم کی نہیں، بلکہ شوہروں کے ہر حکم کی اطاعت ہے۔ یعنی مردوں کی ہر طبعی و ذوقی خواہش اور ان کے نفس کی ہر اُکساہٹ کو پورا کرنا عورتوں پر لازم نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے صرف ان امور میں مردوں کی اطاعت لازم ہے جو خاندان کے ادارے سے براہ راست متعلق اور اس کو چلانے کے لیے از حد ضروری ہیں۔

'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ' کا یہ مفہوم کہ جو نیک عورتیں ہیں، وہ اپنے شوہروں کی فرماں بردار ہوتی ہیں، بعض حضرات کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہاں 'قنت' کا معنی تو اطاعت ہی ہے، مگر اس سے مراد کسی انسان کی نہیں، بلکہ خدا کی اطاعت کرنا ہے، یعنی اس جملے کا صحیح ترجمہ ان کے ہاں یہ ہے: نیک عورتیں وہ ہیں جو اللہ کی فرماں بردار ہوتی ہیں۔ 'قٰنِتٰتٌ' کے بارے میں یہ رائے قدیم اور جدید، دونوں ادوار میں بعض حضرات نے اختیار کی ہے۔ تاہم رائے میں اس اشتراک کے باوجود ان دونوں گروہوں کا طریق استدلال چونکہ باہم مختلف ہے، اس لیے ہم بھی ذیل میں ان پر الگ الگ تبصرہ کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اول الذکر حضرات نے اپنی رائے کے حق میں پہلا استدلال لغت کی کتابوں سے اور دوسرا قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمالات سے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس لفظ کے جو معانی اہل لغت نے نقل کیے ہیں، وہ سب کے سب خدا اور دین سے متعلق ہیں، جیسے خدا کی اطاعت، دعا اور عبادت، نماز و قیام اور طول قیام وغیرہ۔ اسی طرح یہ لفظ زیر بحث مقام کے علاوہ قرآن مجید میں جہاں بھی آیا ہے، صرف اور صرف خدا ہی کی ذات کے حوالے سے آیا ہے۔ چنانچہ اس لفظ کے معانی اور قرآن میں اس کے مواقع استعمال، یہ دونوں مل کر اس بات کی کافی دلیل ہو جاتے ہیں کہ 'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ' میں بھی یہ خدا ہی کی اطاعت اور اسی کی فرماں برداری کے لیے آیا ہے۔

ان لوگوں کی رائے کے پس منظر میں جو بنیادی غلطیاں ہیں، ان کی اصلاح کے لیے ذیل کی کچھ باتیں مدّنظر رہنی چاہییں:

پہلی یہ کہ 'قنت' کے وہ سب استعمالات جو دینی امور سے متعلق ہیں، عربی زبان میں واقعتاً موجود ہیں، مگر سوال

یہ ہے کہ ان کی بنیاد پر اس کے دوسرے استعمالات، حتیٰ کہ اس کے عمومی معنی کی بھی نفی کر دینا، یہ کس اصول پر جائز ہے؟ اور اگر یہ جائز ہے تو پھر ایسا کرنا ہر لفظ کے ساتھ جائز کیوں نہیں ہے؟ مثال کے طور پر 'عبد' کا لفظ بھی اپنے دینی استعمالات کی بنیاد پر انھی سے خاص ہونا چاہیے اور یہ بالکل ناجائز ہو کہ اسے غیر دینی معاملات، جیسے غلامی وغیرہ میں ہم استعمال کر سکیں۔

دوسری بات یہ کہ جس شخص کو عربی زبان کی شد بد ہے، وہ جانتا ہے کہ 'قنت' کا اصل معنی اطاعت کرنا ہے[۲]، قطع نظر اس سے کہ وہ اطاعت اللہ کی ہے یا پھر غیر اللہ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں اس لفظ کے دونوں استعمالات موجود ہیں، حتیٰ کہ خاص میاں بیوی کے تعلق سے بھی اس لفظ کے استعمال کی اہل لغت نے باقاعدہ مثالیں دی ہیں[۳]۔ لٰہذا 'قنت' کو صرف خدا کے ساتھ مخصوص قرار دے کر غیر خدا کے لیے اسے ممنوع ٹھیرا دینا، ایک طرح کا تحکم اور پھر اسی کی روشنی میں 'قٰنِتٰتٌ' کو خاص کر ڈالنا، ایسی جسارت ہے کہ جس کی کوئی قابل قبول توجیہ نہ علمی دنیا پیش کر سکتی ہے اور نہ عربی لغت کی کتابیں ہی۔

تیسرے یہ کہ قرآن جب کسی لفظ کو اس کے لغوی معنی سے اوپر اٹھا کر مخصوص دینی مفہوم میں استعمال کرتا ہے تو اس سے یہ قطعی طور پر لازم نہیں آتا کہ وہ لفظ اب اس نئے مفہوم سے خاص ہو کر اپنا اصل لغوی معنی کھو بیٹھا ہے یا پھر اس معنی کا قرآن میں برت لینا اب شرعاً ممنوع ہو گیا ہے، اس لیے کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے جو زبان کو محض ابلاغ کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ زبان کی تخلیق اور اس میں بیان کی ندرتیں پیدا کرنا، اس کا اصل کام نہیں ہے۔ چنانچہ جہاں ضرورت داعی ہو گی، یہ لفظ کو اس کے لغوی معنی میں برتے گی اور جب موقع ہو گا، اس کو اپنے ہی دیے ہوئے مخصوص مفہوم میں استعمال کر لے گی۔ اس بات کی وضاحت کے لیے، مثال کے طور پر لفظ تقویٰ کو دیکھ لیا جا سکتا ہے جو بحیثیت دینی اصطلاح قرآن میں بکثرت آیا ہے، مگر اس کے باوجود عام بول چال میں بھی اور خود قرآن میں بھی اپنے لغوی معنی میں عام طور پر مستعمل رہا ہے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

۲؎ حوالے کے لیے ابن درید کی ''جمہرۃ اللغۃ''، جوہری کی ''الصحاح''، ابن فارس کی ''مقاییس اللغۃ''، ابن سیدہ کی ''المحکم'' اور علامہ زبیدی کی ''تاج العروس''، مثال کے طور پر دیکھ لی جا سکتی ہیں۔

۳؎ جیسے اہل زبان کا یہ محاورہ: 'قنتت المرأۃ لبعلھا أو لزوجھا' کہ جسے ابن سیدہ نے ''المحکم''، ابن منظور نے ''لسان العرب'' اور علامہ زمخشری نے ''اساس البلاغۃ'' میں نقل کیا ہے۔ اور اسی طرح 'إمرأۃ قنوت' کی ترکیب بھی کہ جو آخر الذکر کتاب میں نقل ہوئی ہے۔

چوتھی بات یہ کہ قرآن میں جب ایک ہی لفظ متعدد جگہوں پر آئے تو اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ہر مقام پر اس کو ایک ہی مفہوم میں سمجھیں، وہ اس لیے کہ ہر دوسری کتاب کی طرح قرآن مجید بھی ایک ہی لفظ کو بہ تقاضاے کلام اس کے کئی پہلوؤں سے استعمال کرتا ہے۔ کبھی لغوی معنی میں تو کبھی اصطلاحی معنی میں، کبھی عموم میں تو کبھی تخصیص میں یا پھر کبھی تجرید میں۔ اب وہ شخص خدا کی اس کتاب پر نہایت ظلم کرے گا جو لفظ کے ان متنوع استعمالات سے صرف نظر کرتے ہوئے ہر مقام پر ایک ہی معنی کا اطلاق کر دے گا اور اس کے پاس اپنے اس غیر علمی رویے کی دلیل ہو گی تو بس یہ کہ اکثر مقامات پر یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔

اوپر کی ان سب باتوں سے ہماری غرض یہ ہے کہ 'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ' میں آنے والا 'قنوت' کا لفظ نہ تو عربی زبان میں خدا کی اطاعت کے ساتھ خاص ہے اور نہ قرآن کے دیگر مقامات کی بنا پر یہاں بھی اس کو خدا ہی کے ساتھ خاص قرار دینے کا کوئی جواز ہے۔ یہ جملہ اصل میں شوہروں کی قوامیت کا تقاضا ہے، اس لیے اس کا صحیح ترجمہ یہی بنتا ہے کہ جو نیک عورتیں ہیں، وہ شوہروں کی فرماں بردار ہوتی ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قدیم دور کے چند علما نے بھی 'قٰنِتٰتٌ' کا ترجمہ اللہ کی فرماں بردار عورتیں کیا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، مگر ان کے ہاں 'قنوت' کی لفظی بحث سے زیادہ 'قٰنِتٰتٌ' کے متعلق کی تعیین اصل مسئلہ ہے کہ وہ 'اَلرِّجَالُ' ہے یا پھر لفظ 'اللّٰہُ'۔ کیونکہ اس کو 'اَلرِّجَالُ' سے متعلق کریں تو ترجمہ یہ ہوتا ہے: جو نیک عورتیں ہیں، وہ اپنے شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ اور اگر اسے لفظ 'اللّٰہ' سے متعلق کر دیں تو مطلب یہ ہو جاتا ہے: جو نیک عورتیں ہیں، وہ اللہ کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ متعلق کی اس تعیین میں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، فیصلہ کن چیز اس کلام کے الفاظ اور اس کا سیاق ہی ہوتا ہے، اس لیے زیر بحث آیت اور اس کے سیاق میں جو ممکن وجوہ اس تعیین کے ہو سکتے ہیں، ان کا ذکر ہم ذیل میں کیے دیتے ہیں:

اول، بڑی سادہ سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شوہر کو سربراہی دی تو پہلے اس کے دلائل دیے اور پھر اس کے لازمی تقاضے، یعنی بیوی کی اطاعت گزاری کو بیان کر دیا اور بس۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شوہر جو کہ سربراہ ہے، اسی کی اطاعت کے ذکر کو اس مقام سے واضح مناسبت ہے۔ اس کے بجاے اللہ کی اطاعت گزاری کا بیان کرنا، اس کا یہاں کوئی موقع ہے اور نہ کوئی محل۔ یہ بات ایک اور طرح سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ 'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ' کے شروع میں ایک 'ف' ہے جو بہرحال زائد نہیں ہے۔ اس کا حق اگر صحیح طور پر ادا کیا جائے تو یہ جملہ اصل میں مرد کی سربراہی کے لازمی تقاضے کا بیان ہے اور یہ تقاضا، ظاہر ہے اس کی اطاعت تو ہو سکتا ہے خدا کی اطاعت نہیں۔ سو اس طرح بھی

واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں 'اَلرِّجَالُ' کا لفظ ہی 'قٰنِتٰتٌ' کا مفعول ہے۔

دوم، 'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ' کے بعد 'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ' کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ نہیں کیا جاتا کہ وہ عورتیں اللہ کے رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، بلکہ سب کے نزدیک اس کا مفہوم یہی ہے کہ وہ شوہروں کے رازوں کی حفاظت کرتی ہیں اور ایک دوسری تاویل کے مطابق، وہ شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کے مال و ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی ہر دو صورت میں 'حٰفِظٰتٌ' کا متعلق 'اَلرِّجَالُ' ہی قرار پاتا ہے۔ چنانچہ 'قٰنِتٰتٌ' جو 'حٰفِظٰتٌ' ہی کی طرح 'فَالصّٰلِحٰتُ' کی خبر ہے اور بغیر حرف عطف کے آئی ہے، اس کا متعلق بھی وہی ہونا چاہیے جو 'حٰفِظٰتٌ' کا ہے۔ تالیف کلام یہ ہوگی: 'قانتات للرجال و حافظات لغیبھم'۔

سوم، ہماری علمی تربیت کے لیے قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر یہ طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ وہ ایک مشفق استاد کی طرح پہلے تو کچھ چیزوں کو اجمال میں ذکر کرتا، پھر ان کی طرف کچھ اشارے کرتا چلا جاتا اور آخر کار انھیں بالکل کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ زیر بحث آیت میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اس نے پہلے تو 'قٰنِتٰتٌ' کے مفعول کو حذف کیا ہے، پھر 'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ' میں اس کی طرف کچھ اشارہ کر دیا ہے، اور اس کے بعد 'فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ' (اگر وہ عورتیں تم مردوں کی اطاعت کر لیں) کے الفاظ سے جس طرح 'قٰنِتٰتٌ' کا معنی کھول دیا ہے کہ وہ اطاعت کرنا ہے، اسی طرح اس کے مفعول کو بھی بالکل ہی واضح کر دیا ہے کہ یہ کوئی اور نہیں، بلکہ 'اَلرِّجَالُ' ہی ہے۔

چہارم، اس تعیین کی تائید میں ضمنی طور پر ایک اور بات بھی پیش کی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید کے پیش نظر اگر یہی بیان کرنا ہوتا کہ بیویاں اللہ کی فرماں بردار ہیں تو وہ 'قٰنِتٰتٌ' کو 'فَالصّٰلِحٰتُ' کی خبر نہ بناتا، بلکہ اس صورت میں 'فالصالحات القانتات حافظات' کا اسلوب زیادہ موزوں ہوتا، یعنی ''جو نیک عورتیں ہیں، وہ فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں''، اس کے بجائے یہ کہا جاتا کہ جو نیک اور خدا کی فرماں بردار عورتیں ہوتی ہیں، وہ رازوں کی حفاظت کرتی ہیں۔

غرض یہ کہ آیت کے الفاظ اور اس کے سیاق سے واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ 'قٰنِتٰتٌ' کا متعلق 'اَلرِّجَالُ' ہی ہے۔ چنانچہ مذکورہ حضرات کی رائے کے برعکس آیت کا صحیح ترجمہ یہی ہے کہ جو نیک عورتیں ہیں، وہ مردوں کی فرماں بردار ہوتی ہیں۔

دوسرا تقاضا

'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ': یہ الفاظ قوامیت کا دوسرا تقاضا بیان کرتے ہیں۔ اس میں 'اَلْغَیْب' کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لفظ آیا ہے جس سے مراد شوہروں کے راز ہیں۔ شوہروں کے راز اس لیے کہ اس کا ذکر انھی کی قوامیت کے ذیل میں اور انھی کی قوامیت کے تقاضے کے طور پر یہاں آیا ہے[4]۔ اس کے بعد 'بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ' کے الفاظ ہیں جو بیویوں کو رازوں کی حفاظت کی ترغیب دینے اور اس عمل کی تحریک پیدا کرنے کے لیے آئے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے قرآن میں اس مقصد کے لیے جا بجا خدا کی صفات آیا کرتی ہیں[5]۔ اور اس اعتبار سے یہ محرک مزید ہیں کہ 'فَالصّٰلِحٰتُ' میں ایک طرح کی ترغیب پہلے ہی سے پائی جاتی ہے، جیسا کہ اوپر ہم نے بیان کیا۔ غرض یہ کہ اس پورے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جو نیک عورتیں ہیں، وہ جس طرح مردوں کی فرماں بردار ہوتی ہیں، اسی طرح ان کے رازوں کی بھی حفاظت کرتی ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔

بعض حضرات 'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ' کا مفہوم اس سے مختلف بیان کرتے ہیں، جو کچھ اس طرح ہے: جو نیک عورتیں ہیں، وہ شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کے حقوق، یعنی ان کے مال اور اپنی عزت وغیرہ کی حفاظت کرتی ہیں، جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے یا اس لیے کہ اللہ نے بھی ان کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ ان کا بیان کردہ یہ مفہوم کیا آیت قرآنی کے الفاظ سے مطابقت اور اس کے سیاق سے کچھ مناسبت رکھتا ہے، اس سلسلے میں ذیل کی کچھ چیزیں ملحوظ رہنی چاہییں:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پہلی یہ کہ اس رائے کو مان لینا اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جب 'الْغَيْب' سے راز نہیں، بلکہ شوہروں کی غَیبت، یعنی ان کی غیر حاضری کی حالت کو مراد لیا جائے، حالاں کہ عربی زبان میں یہ لفظ کسی مخفی اور پوشیدہ بات ہی کے لیے زیادہ مشہور ہے اور قرآن میں بھی بالعموم یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، اور جس مقام پر یہ ظرف کے معنوں میں آیا بھی ہے تو وہاں ظرفیت کی 'ب' کے ساتھ ہی آیا ہے۔ مثال کے طور پر 'ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ' اور 'مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ' کی آیات میں[6]۔ لہٰذا زبان و بیان کی شہادت اور قرآن مجید میں اس کے طریق استعمال کی بنا پر ضروری ہے کہ یہاں بھی راز اور مخفی بات کے معنی ہی کو ترجیح دی جائے۔

---

[4] دوسرا احتمال اللہ کے رازوں کی حفاظت کا ہو سکتا تھا، مگر وہ اس لیے ممکن نہیں کہ اس بات کا اس سیاق میں کوئی موقع ہے اور نہ خدا کے اسرار کی حفاظت کرنا، یہ دین اسلام ہی کا کوئی مسئلہ ہے۔

[5] مثال کے طور پر، باطل طریقوں سے مال کھانے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے سے روکا گیا تو اس کے بعد اسی طرح کی تحریک اور ترغیب ان لفظوں میں آئی ہے: 'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا'، ''اس لیے کہ تمھارا رب بھی تم پر بڑا مہربان ہے'' (النساء ۴: ۲۹)۔

[6] یوسف ۱۲: ۵۲۔ ق ۵۰: ۳۳۔

دوسرے یہ کہ ہمارے اختیار کردہ ترجمے میں 'حٰفِظٰتٌ' کا لفظ 'الْغَیْب' سے حقیقی طور پر متعلق ہے اور اس تعلق کو واضح کرنے کے لیے کسی قرینے یا دلیل کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ اس کے برعکس، معترضین کی راے میں حقیقی کے بجاے ان دونوں میں مجازی تعلق کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ کسی شخص کی غیر حاضری کی حفاظت کرنے کے کچھ معنی نہیں، لیکن مجازی معنی مراد لینے کے لیے جس قرینے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، وہ بہر حال یہاں موجود نہیں ہے۔

تیسری یہ کہ ہمارے ترجمے کے لحاظ سے 'حٰفِظٰتٌ' کا فاعل بیویاں ہیں اور اس کا مفعول 'الْغَیْب'، یعنی شوہروں کے راز ہیں اور اس پر آنے والا حرف 'ل' اصل میں اس کے مفعول ہونے ہی کو واضح کر رہا ہے۔ لیکن مذکورہ راے میں اس کے بجاے ایک دوسرے مفعول کو محذوف مان لیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی وجہ نہیں بیان کی گئی کہ اصل مفعول کو کیوں چھوڑ دیا گیا اور اسے کیوں فرض کر لیا گیا ہے؟

چوتھی یہ کہ بیویوں کو شوہروں کے مال اور ان کی اپنی عزت کے بارے میں ہدایات دینے کا اس سیاق میں اصلاً کوئی موقع نہیں ہے۔ پہلی بات کا اس لیے نہیں کہ وہ دین کی عمومی تعلیم ہے اور ہر ایک کو اپنے تصرف میں دیے ہوئے مال کی حفاظت کرنا ہی ہے اور دوسری کا اس لیے نہیں کہ عورت بیاہی ہو یا اَن بیاہی، ہر دو صورت میں اسے اپنی عزت و ناموس کے بارے میں محتاط رہنا ہی ہے۔ اس کے بجاے مرد کی قوامیت اور اس کے تقاضوں کے سیاق میں بتانے کی اصل بات تو یہی ہے کہ عورت خاندان کے ادارے میں چونکہ ایک اجنبی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک کامل فریق کی حیثیت سے داخل ہوتی، اس ادارے کو اپنا تی اور اس کے ہر نفع و نقصان کو اپنا نفع اور نقصان خیال کرتی ہے، اس لیے اشد ضروری ہے کہ وہ اس کے ہر بھید کی امین اور اس کے ہر راز کی محافظ ہو۔

امین احسن اصلاحی

انسان کی فطرت اور اس کا طرز عمل

سوال: تاریخ انسانی کو پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل حق کی تعداد ہر زمانہ میں کم رہی ہے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت سلیم نہیں ہے۔ جبکہ قرآن مجید کا دعویٰ اس کے برعکس ہے۔ آخر کسی چیز کی فطرت کا اندازہ اس کے طرز عمل کی تاریخ ہی سے مستنبط کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی فطرت تو سلیم ہے، مگر اکثر اس کے بھٹک جانے کے بھی امکانات ہیں، کیونکہ وہ ایک امتحان گاہ میں رہ رہا ہے۔ مگر محال معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سلیم کے ہوتے ہوئے وہ بھٹک جائے؟ آخر اس کی فطرت کے متعلق حکم لگانے کے لیے اس کے مسلسل طرز عمل کو نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہی حال شرک کا ہے۔ آدمی کتنی ہی کوشش کرے کسی نہ کسی پیمانے میں شرک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے؟ یہ حال ایک مسلمان کا ہوتا ہے، جسے احکام شریعت کا پتا ہوتا ہے۔

جواب: اس امر میں تو شبہ نہیں ہے کہ دنیا میں نیکی اور بھلائی کی زندگی بسر کرنے والے ہمیشہ تھوڑے ہی رہے ہیں، اکثریت ہمیشہ حق سے منحرف ہو کر زندگی بسر کرنے والوں ہی کی رہی ہے، لیکن اس صورت حال کو اس چیز کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا کہ انسان کی فطرت ہی بری ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں ایک طرف یہ بات صحیح ہے کہ دنیا میں ہمیشہ برائی کی زندگی بسر کرنے والوں ہی کی اکثریت رہی ہے، وہیں یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ جہاں تک پسند کرنے کا تعلق ہے، دنیا میں ہمیشہ نیکی کی زندگی پسند کرنے والوں کی اکثریت رہی ہے۔ جو لوگ رات دن ظلم، ناانصافی، خیانت، بدعہدی، بدکاری اور فسق و فجور میں مبتلا ہیں، اگر ان سے بھی آپ دریافت کیجیے کہ وہ ایمان داری کے ساتھ

بتائیں کہ ظلم اور انصاف، بخل اور فیاضی، جھوٹ اور سچ، خیانت اور امانت، غرور اور تواضع میں سے کس چیز کو وہ پسند کرتے ہیں تو انشاء اللہ ان کی عظیم اکثریت جو جواب دے گی، وہ ظلم کے مقابل میں انصاف، بخل کے مقابل میں فیاضی اور جھوٹ کے مقابل سچ کے حق میں ہوگا۔ اب سوچیے کہ اگر انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے شر پسند ہے اور اپنی عملی زندگی سے وہ اسی چیز کا ثبوت بھی مہیا کر رہا ہے تو آخر اس کی پسند اور ناپسند کا معاملہ اس کے طرز عمل سے بالکل مختلف کیوں واقع ہوا ہے؟

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ محض روایات اور عام خیالات کا رعب ہے کہ جہاں تک پسندیدگی کے اظہار کا تعلق ہے، انسان وہ نیکی کے حق میں کر دیتا ہے، ورنہ وہ پسند بھی درحقیقت برائی ہی کو کرتا ہے تو یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ جب دنیا میں برائی کی راہ چلنے والوں ہی کی اکثریت ہے تو نیکی کے حق میں یہ فضا کس چیز نے پیدا کر رکھی ہے کہ برائی کی زندگی بسر کرنے والوں کے سامنے بھی اگر برائی اور بھلائی، دونوں کو سامنے رکھ کر ان سے پوچھیے کہ ان میں سے کس کو ترجیح دیتے ہو تو وہ اپنا ووٹ بھلائی ہی کے حق میں ڈالیں گے۔ روایات تو عمل سے قائم ہوتی ہیں۔ جب اکثریت کا عمل برا ہے تو نیکی کے حق میں یہ روایت کس طرح قائم ہوگئی کہ عادی سے عادی چور بھی چوری کی تعریف سے گریز کرتا ہے اور ایمان داری کی زندگی کی تعریف کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہمارے نزدیک آدمی کا اپنے عمل کے بالکل خلاف نیکی کے حق میں شہادت دینا صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ برائیوں میں مبتلا رہنے کے باوجود بھی اس بات کو جانتا ہے کہ برائی کی یہ زندگی اس کی اپنی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اپنی ہر برائی پر خود اپنے ضمیر کو (جب تک وہ بالکل مردہ نہ ہو جائے) ملامت کرتے ہوئے پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے اسی ضمیر اور اپنی اسی فطرت پر دوسروں کے ضمیر اور دوسروں کی فطرت کو بھی قیاس کرتا ہے، اس وجہ سے قدرتی طور پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے بھی، خواہ وہ عملاً کتنی ہی فاسقانہ زندگی بسر کریں، پسند وہ عفت اور پاک دامنی ہی کی زندگی کرتے ہیں، یہ چیز اس کو مجبور کرتی ہے کہ خواہ اس کی اپنی زندگی کتنی ہی برائیوں میں مبتلا ہو، لیکن وہ تعریف نیکی ہی کی کرے تاکہ دوسروں کی نظروں میں وہ ذلیل و حقیر بن کے نہ رہ جائے۔ انسان کی اسی فطرت کی بنا پر قرآن مجید نے کہا ہے کہ 'بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ'* (انسان خود اپنے خلاف گواہ ہے اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے)۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ انسان کی فطرت کی نیکی پسندی کا لازمی تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ وہ برائی کی راہ نہ اختیار کرے یا نہ اختیار کر سکے۔ آخر انسان کی فطرت حیوانات کی جبلت کی طرح تو نہیں ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع

* القیامہ ۷۵: ۱۴-۱۵۔

ہی نہ ہو سکے۔ حیوانات تو قدرت کی طرف سے ایک مخصوص ڈگر پر ہانک دیے گئے ہیں، وہ اس ڈگر سے انحراف اختیار نہیں کر سکتے، لیکن انسان کی سرشت پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو قدرت نے اس کو اچھی فطرت پر پیدا کیا ہے، یعنی اس کو بھلائی اور برائی کا امتیاز بخشا ہے اور بھلائی کی قدر اس کے اندر ودیعت کی ہے۔ دوسری طرف اس کو اختیار اور آزادی کی نعمت بھی بخشی ہے، یعنی وہ بھلائی اور برائی کی ان دونوں راہوں میں سے کسی ایک راہ کو اختیار کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ وہ ان میں سے ہر راہ کو اختیار کرنے کے لیے آزاد ہے۔ وہ اپنے انتخاب سے چاہے بھلائی کی راہ اختیار کرے، چاہے برائی کی۔

اب رہا یہ سوال کہ بھلائی اور برائی کے درمیان امتیاز رکھنے اور بھلائی کو پسند کرنے کے باوجود انسانوں کی اکثریت برائی میں کیوں مبتلا پائی جاتی ہے؟ تو اس کا بہترین جواب وہ سمجھ میں آتا ہے جو قرآن نے دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر برائی چونکہ نفس کے لیے اپنے اندر ایک فوری لذت یا جلدی حاصل ہو جانے والا نفع رکھتی ہے، اس وجہ سے انسان برائی کو برائی سمجھنے کے باوجود اس میں آلودہ ہو جاتا ہے۔ برعکس اس کے بھلائی کے جو کام ہیں، ان کے ساتھ اس طرح کی فوری لذتوں کی کوئی چاٹ نہیں ہوتی، اس وجہ سے عام لوگ ان کو ایک اعلیٰ نصب العین تسلیم کرنے کے باوجود ان کے لیے ہمت نہیں کرتے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس بات کو آپ دوسرے لفظوں میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ بھلائی اور نیکی کے کاموں کی فطرت قدرت نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ ان کے انجام دینے کے لیے ہمارے نفس کو ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے جس کے لیے عزم و ہمت کی ضرورت ہے اور اس عزم و ہمت کو پیدا کرنے کے لیے آدمی کو اپنی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ برعکس اس کے برائی کے کاموں کے لیے آدمی کو اپنے نفس کو اس کی خواہشات کے بہاؤ پر چھوڑ دینا کافی ہوتا ہے، اس کے لیے کسی ریاضت یا کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، اس وجہ سے اس کوچہ میں ہر شخص آسانی سے تیس مار خاں بن سکتا ہے۔

آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ دنیا میں جتنے کام بھی کچھ قدر و قیمت رکھنے والے ہیں، سب ہی کسی نہ کسی حد تک مشقت طلب ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لیے حوصلہ کرنے والے کم نکلتے ہیں اگرچہ ان کے ساتھ کسی عاجل کی چاٹ بھی ہو۔ آپ جس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس طبقہ کے کتنے افراد وہ لائن اختیار کرتے ہیں جو آپ نے اختیار کی ہے[1]۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ دوسری لائنوں کے مقابل میں اس لائن میں ذرا مشقتیں زیادہ ہیں۔ حالاں کہ دنیوی نقطۂ نظر سے اس کے فوائد واضح ہیں۔

اسی پر قیاس نیکی اور بدی کے کاموں کو کر لیجیے۔ ایک میں محنت فوری اور نفع ادھار ہے، دوسرے میں محنت تھوڑی

---

[1] سائل انجینئرنگ کالج کے ایک طالب علم تھے۔

اور لذت عاجل ہے، اس وجہ سے پہلے کی طرف (اس کے پسندیدہ ہونے کے باوجود) کم لوگ توجہ کرتے ہیں اور دوسرے پر (اس کے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود) ایک خلقت ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ عشقیہ ناولوں کے پڑھنے کے مقابل میں فلسفہ کا مطالعہ ایک عمدہ کام ہے، عقلاً بھی اور نقلاً بھی۔ لیکن فلسفہ کے مقابل میں آپ کو ناول پڑھنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ملے گی اور لطف یہ کہ وہ اعتراف بھی کریں گے کہ یہ محض وقت کی بربادی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب یہ وقت کی بربادی ہے تو اس مشغلہ شریف میں کیوں وقت برباد کرتے ہیں؟ محض اس وجہ سے کہ تھوڑی دیر کے لیے نفس کو اس سے تھوڑا سا سرور حاصل ہو جاتا ہے۔

جو حقیقت میں بیان کر رہا ہوں، اس کو سب سے زیادہ دل نشیں انداز میں تو قرآن، حدیث، امثال سلیمان اور انجیل میں بیان کیا گیا ہے، لیکن میں آپ لوگوں کے ماحول اور ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں ارسطو کی وہ تقریر اپنے لفظوں میں پیش کرتا ہوں جو اس نے اسی سوال پر بحث کرتے ہوئے کی ہے۔

ارسطو کے نزدیک انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے اگرچہ نیکی پسند واقع ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ عملاً برائی میں جو زیادہ مبتلا پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی کی فطرت وحدت اور بدی کی فطرت انتشار کی متقاضی ہے۔ اگر آپ نیکی کی زندگی بسر کرنا چاہیں تو آپ کو کوشش کر کے اپنی تربیت اس طرح کرنی پڑے گی کہ آپ کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں ایک متعین ہدف پر استعمال ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز تربیت و ریاضت کی محتاج ہے۔ برعکس اس کے بدی کی زندگی گزارنے کے لیے اس قسم کی کوئی زحمت آپ کو اٹھانی نہیں پڑے گی، بلکہ اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو مطلق العنان چھوڑ دینا کافی ہے۔

وہ اس حقیقت کو مثالوں سے یوں واضح کرتا ہے کہ اگر ایک آدمی ماہر نشانچی بننا چاہے تو لازماً اسے ایک مدت تک ایک متعین ہدف پر نشانہ بازی کی مشق کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایک مشکل کام ہے۔ برعکس اس کے اگر ایک شخص اپنا نصب العین یہ قرار دے لے کہ جہاں بھی تیر لگ جائے، وہی نشانہ ہے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس معنی میں ہم اور آپ سب ہی نشانچی ہیں۔ اب دیکھیے کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے تو ہم میں سے ہر شخص پہلے مفہوم میں نشانچی بننے کا شوق اور ولولہ رکھتا ہے، لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے، ہماری اکثریت ویسے ہی نشانچیوں پر مشتمل ہے جن کا نظریہ یہی ہے کہ جہاں تیر لگ جائے وہی نشانہ ہے۔

ارسطو ہی نے یا کسی اور فلسفی نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ایک اور مثال دی ہے، وہ بھی اچھی خاصی بصیرت افروز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ایک چشمہ کے پانی کو نشیب و فراز کی نالیوں سے گزارتے ہوئے کسی چمن تک

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پہنچانا ہوتو یہ کام ایک اعلیٰ کام ہے اور انسان کو بالطبع یہ پسند ہے، لیکن ساتھ ہی یہ مشقت طلب بھی ہے۔ لیکن اگر مقصود یہ ہو کہ چشمہ کا پانی جدھر چاہے پھیل جائے تو اس کے لیے نہ کسی محنت کی ضرورت ہے، نہ کسی انجینئرنگ کی۔ اگرچہ اس صورت حال کو پسند کوئی بھی نہیں کرتا، سب ہی اس کو ضیاع اور بربادی سمجھتے ہیں، لیکن عملاً اکثریت کے طرز عمل کا نتیجہ یہی نکل رہا ہے۔

نیکی اور بدی کی یہی فطرت ہمارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمائی کہ 'حفّت الجنة بالمکارہ و حفت النار بالشھوات' (جنت مشکلات سے گھیر دی گئی ہے اور دوزخ مرغوبات سے گھیر دی گئی ہے)۔ اسی بات کو سیدنا مسیح علیہ السلام نے یوں واضح فرمایا ہے کہ بدی کی راہ فراخ اور کشادہ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں۔

یہاں پہنچ کر مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر خدا نے نیکی کی راہ کو مشکل کیوں بنا دیا، اس کو بھی بدی کی طرح لذیذ اور نفع عاجل بخشنے والی کیوں نہیں بنا دیا؟ اگر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو تو آپ اس کے ساتھ ہی اس سوال پر بھی غور کیجیے کہ انجینئرنگ کا فن اتنا مشکل کیوں بنا دیا گیا ہے، اسے بھی ناول کی طرح لذیذ اور مرغوب کیوں نہیں بنا دیا گیا؟ جو جواب آپ کا ذہن اس سوال کا دے، وہی جواب بعینہٖ پہلے سوال کا بھی صحیح ہوگا۔

جس طرح بدی میں انسانوں کی اکثریت کا مبتلا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ بدی ہی انسان کی فطرت ہے اسی طرح شرک میں انسانوں کی اکثریت کا مبتلا ہونا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ شرک ہی انسان کی فطرت کا مقتضیٰ ہے۔ اس معاملہ میں بھی عقل اور فطرت کے مطابق بات وہی ہے جو قرآن کہتا ہے، یعنی انسانی فطرت کا اصل تقاضا تو توحید ہی ہے، لیکن اپنی بعض کمزوریوں اور کج فہمیوں کے سبب سے آدمی شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

میں آپ کے سوال کے اس حصہ کا بھی جواب دینے کی کوشش کرتا، لیکن بعینہٖ اسی سوال پر میں نہایت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''حقیقت شرک'' کی دو آخری فصلوں میں بحث کر چکا ہوں۔ ان فصلوں کے عنوان ہیں: ''کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟''، ''شرک کے پیدا ہونے کے حقیقی اسباب''۔ ان دونوں فصلوں میں میں نے اس مسئلہ سے متعلق فلسفۂ جدید کی غلطیاں بھی واضح کی ہیں اور اکثریت کے طرز عمل سے جو شبہ ایک عام آدمی کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، اس کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ محترم مستفسر سے گزارش ہے کہ میری مذکورہ کتاب حاصل کر کے وہ یہ فصلیں ضرور پڑھ ڈالیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کے ذہن کی تمام الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com